انجمن طلبۂ قدیم سٹی کالج

کا

سالنامہ

بابتہ ۱۳۴۳ف

تاریخ اشاعت ۱۲ اردی ۱۳۴۴ف

مرتبہ

سید محی الدین قادری

زیر نگرانی مجلس انتظامی انجمن طلبۂ قدیم

مجلس انتظامی انجمن طلبائے قدیم سٹی کالج

۱۳۴۲ف

بابتہ سنہ ۱۳۴۳ف

صدر۔ مولوی سید خورشید علی صاحب۔ ناظم دفتر دیوانی و مال و ملکی وغیرہ

نائب صدر۔ مولوی محمد عبدالقیوم خاں صاحب۔ مددگار انجنیر عمارات جامعہ عثمانیہ

معتمد۔ مولوی سید محمد صفی صاحب بی اے ال ال بی

نائب معتمد۔ جناب جی۔ بی۔ بھان صاحب

خازن۔ مولوی کریم اللہ خاں صاحب بی اے۔ بی ٹی

معتمد تفریحات۔ مولوی سید احمد خاں صاحب

ارا کین

(۱) مولوی غلام قادر صاحب بی اے

(۲) مولوی عبدالقادر سروری صاحب ام اے ال ال بی

(۳) مولوی عبدالرؤف صاحب بی اے ال ال بی

(۴) مولوی عبدالجبار صاحب بی اے ال ال بی

(۵) مولوی سید معین الدین قریشی صاحب بی اے۔

(۶) مولوی سید محمد صاحب ام اے۔

(۷) ڈاکٹر میر سیادت علی خاں صاحب ام اے ال ال بی بی سی ال۔ ڈی فل

(۸) مولوی عبدالرب صاحب

(۹) جناب رام لال صاحب بی اے۔

(۱۰) جناب ترمبک لال صاحب

(۱۱) جناب مرزا محی الدین بیگ صاحب بی اے۔

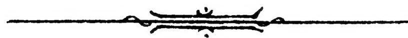
(۱۲) سید محی الدین قادری زور



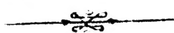
انجمن طلبائے قدیم سٹی کالج کی مجلس انتظامی

فہرست مندرجات

سالنامہ انجمن طلبۂ قدیم سٹی کالج بابتہ ۱۳۴۳ ف



اداریہ



انجمن طلبۂ قدیم سٹی کالج کے احیاء نے حیدرآباد کی اس عظیم الشان درسگاہ کے فیض یافتوں میں اتحاد و یگانگت کی ایک نئی روح پھونک دی۔ اس کو حسن اتفاق سمجھنا چاہئیے کہ اسکی مجلس انتظامی ایسے افراد پر مشتمل ہوی جو اپنے اپنے دائرہ عمل میں خلوص اور مستعدی کے باعث اپنی آپ نظیر سمجھے جا سکتے ہیں۔ اِن اصحاب نے اپنی برادری کی فلاح و بہبود کے لئے جہاں اور طریقے اختیار کئے ایک سالنامہ نکالنے کا بھی تہیہ کیا۔ سٹی ہائی اسکول کے ازمنہ ماضیہ کی یاد تازہ رکھنے اور اُس کے قدیم و جدید طلبہ کے آپس میں رشتہ مواخواۃ کے استحکام کے لئے اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اس سالنامہ کی ادارت کی اہم ذمہ داری کو قبول کرتے وقت مدیر کو اس امر کا اندازہ نہیں تھا کہ اُس کی نوعیت عام رسائل و سالنامہ جات سے اتنی جدا ہو گی۔ اُس کی سب سے اہم خصوصیت، جس نے سب سے زیادہ پریشان رکھا، یہ ہے کہ اس سالنامہ میں صرف سٹی کالج کے طلبۂ قدیم ہی کی نظم و نثر شامل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس درسگاہ نے

ایسی ایسی اعلیٰ پایہ کی ہستیاں پیدا کی ہیں کہ شاید ہی حیدرآباد کی کوئی اور درسگاہ اس خصوص میں اسکی ہمسری کرسکے اور یہ بھی ظاہر ہے (اور اس سالنامہ کے مطالعہ سے پوری طرح واضح ہوجائیگا) کہ اس مدرسہ نے اچھے اچھے اہل قلم بھی پیدا کئے ہیں اور موجودہ حیدرآباد کی علمی ادبی ترقی میں حصہ لینے والے زیادہ تر اسی درسگاہ کے فیض یافتہ ہیں۔ لیکن اس خوش نصیبی کے باوجود اس سالنامہ کے لئے مضمونوں اور نظموں کو حاصل کرنے میں جو تلخ تجربے اٹھانے پڑے انکا اظہار اس وقت بے موقع ہے۔

اتنے بڑے اور خاص کر سٹی کالج کے شایان شان سالنامہ کی تیاری اور ترتیب میں مدیر کو ہرگز کامیابی نہ ہوسکتی اگر مولوی سید خورشید علی صاحب ناظم دفتر دیوانی ومال وغیرہ اور مولوی عبدالقادر سروری صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ اس کا ہاتھ نہ بٹاتے۔ ان دونوں حضرات اور مدیر کی ایک سب کمیٹی بناکر انجمن کی مجلس انتظامی نے اس کام میں جو سہولت بہم پہونچائی ہے اس کا اظہار لازمی ہے۔ اہل قلم برادران قدیم کی بے اعتنائیوں اور حیدرآباد کی طباعتی دشواریوں کے باوجود ایک ایسے ضخیم اور اہم سالنامہ کی پیش کشی میں کامیابی حاصل کرنا کسی طرح ممکن نہ تھا اگر یہ سب کمیٹی قائم نہ کی جاتی اور یہ دونوں اصحاب مدیر کی ہر طرح سے امداد نہ فرماتے۔

اس سالنامہ کا مطالعہ کرنے والے اس امر کو ضرور ملحوظ رکھیں کہ یہ صرف سٹی کالج ہی کے فیض یافتوں کی علمی وادبی کوششوں کا نتیجہ ہے اور نظم ونثر کی گوناگونی اور معیار کے باعث اردو زبان کے شاید کسی سالنامہ سے کم مرتبہ بھی نہیں ہے۔ اس میں جہاں غزلیں شامل ہیں جدید طرز کی نظمیں بھی موجود ہیں۔ اعلیٰ پایہ تحقیقی وتنقیدی مضامین کے ساتھ دلچسپ افسانوں اور اچھے ڈراموں کو بھی جگہ دی گئی ہے اور اس کی سب سے زیادہ دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ لضف کے قریب مضامین سٹی کالج ہی سے متعلق خاص طور پر

قلمبند کرائے گئے ہیں۔ اس کی تاریخ (محل وقوع، تربیت) اور انجمن طلبۂ قدیم کے آغاز و ارتقاء وغیرہ سے متعلقہ مقالوں کے علاوہ کئی نظمیں اور مضامین لکھوا کر شامل کئے گئے ہیں جو اس درسگاہ کے مختلف زمانوں کی زندگی کی یاد تازہ کرتے ہیں اور قسم قسم کے طلبہ کی مکتبی طرز حیات کو پیش نظر کر دیتے ہیں۔

اس سالنامہ کے مضمون نگار اپنی تحریروں کے ذریعہ سے اپنے اپنے مختلف جولانگہ عمل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو آج اردو دنیا کے مسلم الثبوت ادیب اور انشا پرداز ہیں، اور بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے شاید پہلی ہی دفعہ انشا پردازی کیلئے قلم اٹھایا ہے مگر ان سبھوں کی تحریروں میں ایک خاص زندگی اور لطف موجود ہے۔ اور یہی مقصد ہے اس سالنامہ کی اشاعت کا۔ اگر اس نے سٹی ہائی اسکول اور موجودہ سٹی کالج کے گوناگوں مراتب اور دائرۂ عمل رکھنے والے طلبۂ قدیم کے آپس میں ایک طرح کی یکجہتی اور احساس مواخواۃ پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے حالات و خیالات کی صحیح ترجمانی کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ہو تو سمجھنا چاہئے کہ مدیر اور اس کے شرکائے کار کی محنتیں ٹھکانے لگیں اور آیندہ کام کرنے والوں کے لئے حوصلہ افزائی کا باعث ہوا۔

سید محی الدین قادری زور

سٹی ہائی اسکول کی سرگزشت

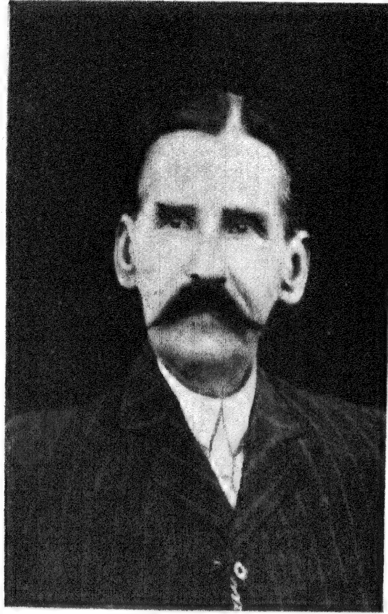
از

مولوی غلام قادر صاحب بی۔اے۔ نائب صدر سٹی کالج

تلاش بے پایاں کے باوجود قیام سٹی ہائی اسکول کے ابتدائی حالات بہم دست نہ ہو سکے۔ صرف اسقدر پتہ چلا کہ سنہ ١٢٧٢ھ میں مدرسہ دار العلوم قائم ہو چکا تھا جہاں علوم والسنہ مشرقیہ کی تعلیم کا معقول انتظام تھا لیکن نواب سالار جنگ بہادر کو جب یہ خیال ہوا کہ بہ اقتضائے حالات ملک میں انگریزی تعلیم کا انتظام کرنا بہت ضروری ہے تو نواب صاحب موصوف نے مدرسہ دار العلوم میں ایک انگریزی معلم کے تقرر کا حکم صادر فرمایا۔ بناء براں ایک انگریزی معلم کا تقرر عمل میں آیا، جو مختلف جماعتوں میں انگریزی تعلیم کے خواہشمند طلباء کو انگریزی تعلیم دیا کرتا تھا۔ بعد ازاں جب انگریزی خواں طلبا کی تعداد میں کچھ اضافہ ہوا تو ایک اور انگریزی معلم مامور کیا گیا۔ یہ طریقہ سنہ ١٢٨٠ فصلی مطابق سنہ ١٢٨٧ھ تک جاری رہا لیکن اب انگریزی خواں طلبا کی تعداد میں زمانے کے لحاظ سے کافی اضافہ ہو گیا تھا اور ضرورت محسوس ہونے لگی تھی کہ انگریزی خواں طلبا کی جماعتیں علیحدہ کر دی جائیں۔ چنانچہ سنہ ١٢٨٠ف میں یہ جماعتیں مدرسہ دار العلوم ہی کے ایک حصے میں علیحدہ کر دی گئیں اور مسٹر بی۔ ایف شافٹر کو اس کا صدر مقرر کر کے جماعتوں کو انگلش اسکول کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ایک سال تک مسٹر شافٹر دو تین مددگاروں کے ساتھ کام چلاتے رہے۔ سنہ ١٢٧٦ھ میں

سررشتۂ تعلیمات کے قیام کے ساتھ اضلاع میں بھی مدارس قائم کئے جارہے تھے چنانچہ سنہ ۱۲۸۱ف میں مسٹر شافر کا تقرر مہتممی تعلیمات پر کردیا گیا اور مسٹر اے راس سنہ ۱۲۸۱ف مطابق جولائی سنہ ۱۸۷۲ء میں انگلش اسکول کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ کچھ ہی عرصہ بعد مڈل اور میٹرک کی جماعتیں قائم ہوئیں اور عدم گنجائش کے باعث پتھر گٹھی پر نواب سالار جنگ بہادر کے اس مکان میں جہاں اب دواخانہ علاج حیوانات واقع ہے یہ مدرسہ منتقل کیا گیا اور اسکا نام سٹی ہائی اسکول رکھا گیا۔ یہ نہ معلوم ہوسکا کہ ابتدا میں اساتذہ کی تعداد کیا تھی کتنی جماعتیں تھیں اور نصاب کیا تھا۔ البتہ ایک قدیم رجسٹر سے صرف اس قدر معلومات حاصل ہوئیں کہ سنہ ۱۳۰۲ف میں بشمول مسٹر راس نو اساتذہ کارگزار تھے۔ مسٹر راس (۲۵۰) تنخواہ پاتے تھے اور راون کے اول مددگار کی تنخواہ (۱۰۰) تھی مدرسہ کے کل اسٹاف کی تنخواہوں کا ماہانہ خرچ (۷۵۹) تھا۔ جس میں ملازمین درجہ ادنیٰ کی تنخواہیں (۱۰۱) روپیہ ماہانہ اور اخراجات صادر بھی شریک ہیں۔ البتہ نومبر سنہ ۱۹۰۶ء مطابق سنہ ۱۳۱۵ف سے اس تعلیمی ادارہ کی تاریخ میرے پیش نظر ہے۔

سنہ مذکور میں میں سٹی ہائی اسکول کی دوسری جماعت میں شریک ہوا۔ یہ جماعت عام طور پر گارتھ ویٹ کلاس کہلاتی تھی اور طلبا اسکو گارتھ ویٹ کہتے تھے۔ وجہ تسمیہ یہ تھی کہ اس جماعت میں گارتھ ویٹ نامی مصنف کی ریڈر پڑھائی جاتی تھی۔ ان دنوں یہاں تحتانیہ کی چار وسطانیہ کی تین اور فوقانیہ کی دو اس طرح جملہ نو جماعتیں تھیں اور سنہ ۱۳۱۵ فصلی کا موازنہ (۱۳۶۶۵) تھا۔ گو سٹی ہائی اسکول میں انگریزی تعلیم کا انتظام ہوچکا تھا، اور طلبا امتحانات مڈل اور میٹرکیولیشن (متعلقہ مدراس یونیورسٹی) میں شریک ہوا کرتے تھے اگر یہاں کی تعلیم کا معیار ابھی معیاری سطح پر نہیں آیا تھا۔ جس کا ثبوت اس امر سے ہوسکتا ہے کہ سنہ ۱۹۰۷ء میں ۲۰ یا ۲۱ امیدوار شریک امتحان مڈل ہوئے تھے، جن کے منجملہ صرف ایک خوش قسمت امیدوار کامیاب ہوا تھا۔ عام طور پر یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ ریاضی کا نتیجہ بیحد خراب رہا اور معلم ریاضی کو (۵) روپیہ جرمانہ بھی کیا گیا۔ باوجود اسکے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انگریزی کا معیار آج کل کی انہیں جماعتوں کے معیار سے کہیں بڑھا ہوا تھا۔ بے موقع نہ ہوگا اگر میں اس زمانے کے اسٹاف کے بارے میں کچھ تحریر کروں مسٹر اے راس صدر مدرس تھے۔ یہ نہ معلوم ہوسکا کہ انکی قابلیت کیا تھی۔ البتہ عام طور پر یہ مشہور تھا کہ یہ میٹرک بھی کامیاب نہ تھے۔ باوجود اس کے مسٹر راس انگریزی کے نہایت کامیاب معلم تھے اور میٹرک کی جماعت کو بھی نہایت سہولت سے انگریزی کی تعلیم دیتے تھے



مسٹر ای۔ راس صدر سنہ ۱۸۷۲ع ۔ سنہ ۱۹۱۱ع



مولوی خان فضل محمد خان صاحب ام ۔ اے
صدر سنہ ۱۳۲۳ف ۔ ۱۳۲۹ف



مولوی سید محمد اعظم صاحب ام ۔ اے بی ایس سی
موجودہ صدر

عام طور پر نہایت خلیق مشہور تھے۔ گو وہ انگلو انڈین تھے مگر ہندوستانیوں کی معاشرت اور انکے طبعی رجحانات سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ ان کا سلوک عام طلباء کے ساتھ بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ ایک ہندوستانی کا ہوتا ہے۔ دن میں کئی کئی دفعہ جماعتوں میں گھوما کرتے تھے۔ حتیٰ کہ تعطیلات کا نوٹس بھی ذریعہ تحریر نہیں بلکہ بہ نفس نفیس سنایا کرتے تھے۔ ان دنوں ہفتے میں دو روز یعنی جمعہ اور یکشنبہ کو تعطیل ہوا کرتی تھی لیکن ۱۳۱۶ف یا ۱۳۱۷ف میں یکشنبہ کی تعطیل مسدود کردی گئی البتہ مسٹر راس اس سے استفادہ کرتے تھے۔ مسٹر راس کا دستور تھا کہ ہفتے میں دو تین روز پہلے گھنٹے میں ہاتھ میں ایک پتلا بید لئے ہوئے جماعتوں میں گشت لگایا کرتے اور ہر جماعت میں جاکر "کل کوئی غیر حاضر تھا" پوچھا کرتے تھے اور گزشتہ دن کے غیر حاضر طلبا کو بید رسید کرتے۔ ایک روز کا عجیب واقعہ ہوا کہ جماعت چہارم کے ایک دبلے پتلے طالبعلم کو غیر حاضری کی علت میں پٹنے کی نوبت آئی۔ مسٹر راس نے ایک بید مارا ہوگا کہ طالبعلم مذکور کچھ ایسا بلبلا کر رویا کہ صاحب موصوف یہ کہتے ہوئے جماعت کے باہر نکلے "دبلے پتلے بچوں کو مارنے کو جی بھی ڈرتا بھئی مرور گئے تو کانکا ٹنٹا" مسٹر راس کے مددگار مسٹر آتما رام تھے۔ غالباً یہ صاحب انڈر گریجویٹ تھے۔ انکے ایک پیر پر عمل جراحی کیا گیا تھا۔ اسلئے ربر کی ٹانگ والے استاد کے نام سے مشہور تھے۔ افسوس ہے کہ مجھے انکی شاگردی کا فخر حاصل نہ ہوسکا، کیونکہ میری شرکت کے کچھ ہی روز بعد ایکدن جب میں حسب معمول صبح کے دس بجے مدرسہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ ربر کی ٹانگ والے استاد کی موت کے باعث مدرسہ کو چھٹی ہوگئی ہے۔ مسٹر آتما رام ریاضی کے ایک اعلیٰ معلم تصور کئے جاتے تھے اور عام طور پر مشہور تھا کہ میٹرک کے معیار کا مشکل سے مشکل ریاضی کا سوال بھی ناس کی ایک چٹکی چڑھا کر چشم زدن میں حل کردیتے ہیں۔

مسٹر آتما رام سورگ باشی کی جگہ مسٹر سوامی اینگار اول مددگار مقرر ہوئے۔ یہ صاحب مدراس کے انڈر گریجویٹ تھے، اور انگریزی خوب پڑھاتے تھے۔ اچھے خاصے سن آدمی تھے مگر اپنے آپ کو پچاس سال سے کم بتاتے تھے طلبا انکو عام طور پر "سنڈے ہیڈ ماسٹر" کے نام سے پکارا کرتے تھے، کیونکہ یکشنبہ کو جب مسٹر راس نہ آتے تو یہ ٹھیک نو بجے صبح مدرسہ میں نازل ہو جایا کرتے، اور بصد طمطراق صدارتی کاروبار میں سرگرم رہتے۔ مزاج بحال رہتا تو کسی لڑکے کی فیس معاف کردیتے۔ برہم رہتے تو چپراسی پر سارا غصہ اتارتے کبھی اور بھی پارہ چڑھا رہتا تو جرمانے کا

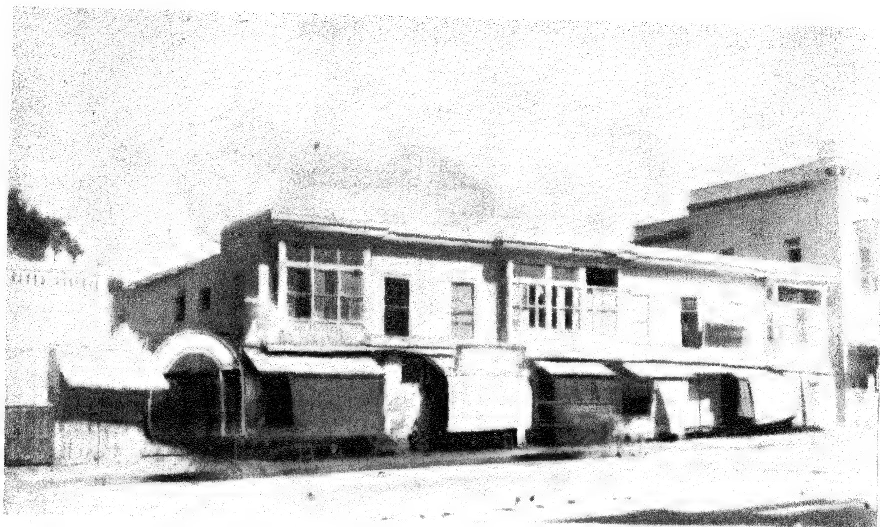
نادری حکم بھی نافذ کرتے تھے۔ مسٹر اینگار بڑے پرلطف مدرس تھے۔ انکے اردو فقروں سے طلبا کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے مارے ڈر کے بیحد ضبط سے کام لیتے تھے البتہ کلاس کے باہر انکے فقروں پر قہقہہ اڑتا تھا۔ اگر کوئی طالبعلم بات چیت کرتا تو مسٹر اینگار فوراً اپنی عینک اتار کر میز پر رکھ دیتے اور آنکھیں مل کر طالبعلم کی طرف رجوع ہوتے اور نہایت غصہ کے لہجہ میں کہتے "آں آں نالائک تو تواب ہنستا ہے زرا کریب تو آ تو نکلے مافک پیٹتا ہوں"۔ اسکے بعد بلا شرکت غیرے یعنی بید کی مدد کے بغیر طالبعلم کی خاطر خواہ مرمت کی جاتی تھی

دوم مددگار مولوی سید حمید الدین صاحب مرحوم تھے۔ مولوی صاحب صرف مڈل کامیاب تھے انکا زیادہ تر تعلق دفتری کاروبار سے تھا لیکن کبھی کبھی اساتذہ کی اتفاقی رخصت کے زمانے میں کسی جماعت میں چلے جایا کرتے تھے جہاں بجائے لڑکوں کو پڑھانیکے خاموش بیٹھتے اور لڑکوں کو بھی خاموش بیٹھنے کا مشورہ دیتے۔ قلت اسٹاف کے باعث ۱۹۱۰ء میں سکنڈ فارم کی انگریزی کی تعلیم مولوی صاحب کے تفویض کی گئی۔ پڑھانے کا ڈھنگ بڑا دقیانوسی تھا۔ ایک دفعہ انگریزی پڑھ کر ترجمہ کر دیا کرتے اور لڑکوں کا کام تھا کہ ڈکشنری کی مدد سے الفاظ کے معنی یاد کریں اور گرامر کے ضابطے از بر کریں۔ بریں ہم امتحان سے قبل مولوی صاحب لڑکوں سے خوب محنت لیتے۔ سالانہ امتحان کے موقع پر مہتمم صاحب تعلیمات مع اسٹاف وخیمہ و خرگاہ تشریف لائے اور سب سے پہلے سکنڈ فارم کی انگریزی کا امتحان لیا۔ مولوی صاحب موصوف نے نہایت متانت سے ارشاد فرمایا "قلت اسٹاف کے باعث انگریزی کی تعلیم ہیچمدز کے تفویض ہوئی ہے۔ دفتری کام کی کثرت کے سبب خاطر خواہ موقع تعلیمی کام کا نہیں مل سکا۔ تاہم بڑی محنت سے لڑکوں کو پڑھایا ہوں۔ ریڈنگ صاف ہے۔ ترجمہ خوب کرتے ہیں لیکن گرامر کسی قدر کمزور ہے" اس طرح ممتحن صاحب کو واقعات سے باخبر کرنے کے بعد امتحان کی جارحانہ کارروائی شروع ہوئی۔ جب ڈکٹیشن لکھایا جا رہا تھا تو مولوی صاحب الفاظ کے اجزا کو علٰحدہ علٰحدہ اس صفائی سے بیان کرتے تھے کہ لڑکے غلطی ہی نہ کرنے پاتے"۔ غرض نتیجہ نکلا تو انگریزی میں سب کے سب پاس۔ پھر کیا تھا چاروں طرف سے مبارک سلامت کا تانتا بندھ گیا اور طلبا نے مولوی صاحب کا منہ بھی میٹھا کیا۔ مولوی صاحب طلباء کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتے۔ کسی طالبعلم کو مارنا تو کجا سخت کلمہ تک زبان سے نہ نکالتے تھے سنہ ۱۹۱۱ء میں مسٹر اس کا تبادلہ چادرگھاٹ ہائی اسکول پر

ہوگیا۔ اور مسٹر راما نجم پلے بی۔ اے ال ٹی انکی جگہ صدر ہو کر تشریف لائے۔ مسٹر پلے ایک قابل شخص تھے۔ انگریزی اور تاریخ جغرافیہ کی تعلیم دینے کا خاص طریقہ تھا۔ لیکن ضبط و انتظام کے معاملے میں بڑے نرم واقع ہوئے تھے۔ جب وہ جماعت میں مضمون وغیرہ کی تصحیح کرتے تو طلبا انکا باقاعدہ محاصرہ کرلیتے اور ہر ایک کو یہ خواہش ہوتی کہ اسی کا مضمون پہلے دیکھا جائے، لیکن چیں بہ جبیں نہ ہوتے بلکہ صاحب موصوف اپنے عزیز طالبعلموں کی معصومانہ درازدستی کا خاموش مشاہدہ کرتے اور نرمی سے ہدایت کرتے کہ اپنی جگہ پر بیٹھیں۔ مسٹر پلے کے زمانہ صدارت میں، نہ معلوم کیوں، مسٹر سبارا ؤ بی۔ ایس سی مدرسہ کے کاروبار پر بہت حاوی تھے۔ اور مسٹر پلے کی عارضی علیحدگی کے زمانہ میں مسٹر سبارا ؤ ہی نگران کار صدر مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۳ء میں مسٹر کرک پٹرک بی اے (الہ آباد) عہدہ صدارت پر مامور ہوئے۔ یہ صاحب پہلے گرام اسکول کے صدر مدرس تھے۔ آدمی نہایت اچھے تھے اور طلبا کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آتے تھے۔ ان کا حلیہ بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ دبلے پتلے آدمی، لانبا قد، چھوٹا سا سر آنکھیں ترچھی، زبان میں ایک خاص قسم کی لکنت جسے ہمارے دکن کی اصطلاح میں تتلا پا کہتے ہیں۔ درازی قد اور لاغری کے باعث چلنے میں ایک خاص لچک بھی تھی جسکو ناشاعر کم سمجھ سکتے ہیں۔ فوقانیہ جماعتوں کو انگریزی کی تعلیم نہایت خوبی سے دیتے تھے۔ جب کبھی کمرہ امتحان میں نگرانی کرتے تو کسی طالب علم کو نقل کرنے کی جرات نہ ہوتی کیونکہ چاہے وہ کسی طرف دیکھیں معلوم یہی ہوتا تھا کہ وہ ہر طرف دیکھ رہے ہیں۔ ورزش جسمانی کے معاملے میں بڑی سختی سے پیش آتے تھے۔ دھوپ ہو یا مینہ برسے ڈرل کرنا لازمی تھا۔ ایک روز میں نے شکایت کی کہ دھوپ میں بیت الخلا کے قریب ڈرل کرتے وقت بڑی بدبو آتی ہے تو اس پر آپنے فرمایا کہ ”ہولڈ یور نوز وِتھ وَن ہانڈ اینڈ ڈو ڈرِل وِتھ دِی اَدَر“ (ایک ہاتھ سے ناک پکڑ دا ور دوسرے ہاتھ سے ڈرل کرو) غرضیکہ یہ لیل و نہار تھے کہ ۱۳۲۳ف خان فضل محمد خاں صاحب ام اے (انگلرکیمرج) پرنسپل مقرر ہوئے اور کچھ عرصہ تک مسٹر کرک پٹرک کے ساتھ کام کرتے رہے۔ صاحب موصوف کے متعلق کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے اس بیس سال قبل کے زمانہ کے بہت سارے واقعات زبان زد خاص و عام ہیں۔ تاہم اس قدر تحریر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس وقت بھی مدرسہ کی حالت کچھ قابل تعریف نہ تھی۔ ڈاکٹر الما لطیفی کی نظامت کا زمانہ تھا شستر کی

ایک حد تک اصلاح ہو چکی تھی اور اساتذہ کی تنخواہوں کی حالت بہتر کردی گئی تھی۔ ساتھ ہی نصاب تعلیم میں اصلاحات کرکے اضلاع اور بلدہ کے مدارس میں بلحاظ ضرورت اساتذہ کی تعداد میں اضافہ کیا جا رہا تھا۔ خاں فضل محمد خاں صاحب نے جائزہ حاصل کرنے کے چند ہی روز بعد مدرسہ کی اصلاح کی طرف توجہ کی گو مسٹر سبارا ؤ اور مسٹر کرک پٹرک کے زمانہ صدارت میں مدرسہ کے ضبط و انتظام میں نمایاں ترقی ہو چکی تھی اور بعض گریجویٹ اساتذہ کے تقررات بھی عمل آئے تھے مگر بلحاظ ضرورت اصلاح کی بہت کچھ گنجائش تھی۔ سائنس کی تعلیم کا نہایت ناقص انتظام تھا۔ گو مسٹر سبارا ؤ بی ایس سی کا بطور سائنس ٹیچر کے تقرر عمل میں آچکا تھا جنکے تبادلہ پر ڈاکٹر اگھوناتھ کے مشہور شاگرد مسٹر دوراج سائنس ٹیچر مقرر ہوئے تھے، مگر معمل میں آلات تجربہ بہت کم تھے۔ ادھر ۱۹۱۲ء سے ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کا امتحان شروع ہو چکا تھا، اور ابتدائی سائنس کی تعلیم تو لازمی کردی گئی تھی لیکن پھر بھی معمل کی اصلاح جیسی کہ چاہئے ویسی نہیں ہوئی تھی۔ ایک طرف عوام کا اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دلانے کا روبہ ترقی میلان، دوسری طرف ڈاکٹر لطیفی کی مساعی کی بدولت مدارس تحتانیہ کا بڑھتا ہوا سیلاب عظیم، نتیجہ یہ ہوا کہ سٹی ہائی اسکول کے وسطانیہ و فوقانیہ طبقوں میں طلبا کی تعداد بہت بڑھ گئی اور موجودہ اسٹاف سے کام چلانا دشوار ہو گیا تھا۔ چنانچہ خاں فضل محمد خاں صاحب نے پہلا کام یہ کیا کہ وسطانیہ اور فوقانیہ جماعتیں مغل کے ہوٹل کے بالائی حصے پر منتقل کردیں اور پتھر گٹی والے قدیم مکان میں صرف تحتانیہ جماعتیں رہ گئیں۔ جن کا انتظام ایک مدرس کے تفویض کیا گیا جو ہیڈ ماسٹر برانچ اسکول کہلاتے تھے۔

اس کے بعد خاں فضل محمد خاں صاحب نے اضافہ اسٹاف کی طرف توجہ کی اور بلحاظ ضرورت ایک مختصر اسکیم منظور کرلیا گیا جس پر جدید اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا اس اسکیم کی منظوری سے صرف موقتی ضروریات رفع ہو سکیں، لیکن آئے دن طلبا کی تعداد میں جو اضافہ ہو رہا تھا اس کے لئے یہ اسکیم بھی ناکافی تھا۔ لیکن حالات زمانہ اسکے مقتضی نہیں تھے کہ وقت واحد میں بڑے بڑے اسکیمات منظور کرائے جائیں اس لئے خاں صاحب موصوف نے اساتذہ کی تعداد میں بتدریج اضافہ فرمایا اور اپنے پنجسالہ زمانۂ صدارت میں مدرسہ کی حالت کو ہر لحاظ سے ترقی دی مگر پھر بھی کثرت کار کے مقابلہ میں اساتذہ کی تعداد متناسب نہ تھی۔ اس



سٹی ہائی اسکول کی پہلی عمارت



سٹی ہائی اسکول کی دوسری عمارت

موقع پر اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ خان صاحب موصوف کے زمانہ صدارت میں نہ صرف اساتذہ وطلباء کی تعداد میں اضافہ ہوا بلکہ مدرسہ کے ضبط و انتظام اور تعلیمی حالت میں بھی نمایاں ترقی ہوئی حقیقت تو یہ ہے کہ سٹی ہائی اسکول کی شہرت کا آغاز خان فضل محمد خاں صاحب ہی کے زمانہ صدارت سے ہوا اور ایسے خاندانوں کے بچے بھی یہاں بغرض تعلیم شریک ہونے لگے، جو مدرسہ عالیہ کے سوا کسی اور مدرسہ میں تعلیم پانا کسرِ شان تصور کرتے تھے۔

سٹی ہائی اسکول ابتدا ہی سے بازیگاہ کے معاملہ میں بڑا بدبخت واقع ہوا ہے۔ خانصاحب موصوف نے بڑی کوشش کر کے کارپردازان اسٹیٹ نواب سالار جنگ بہادر کو اس بات پر ہموار کر لیا کہ نواب صاحب موصوف کی وہ زمین جو موجودہ عدالت فوجداری والے مکان کے روبرو 'نوچمن' کے نام سے مشہور ہے اسکول کی بازیگاہ کیلئے کرایہ پر اٹھا دی جائے۔ چنانچہ (۵۰۰) ماہانہ کرایہ مقرر ہوا اور سرکار سے منظوری بھی حاصل کر لی گئی، لیکن حصول منظوری کے بعد ہی نواب صاحب موصوف نے نوچمن کو کرایہ پر دینے سے انکار کر دیا اور اس خصوص میں سٹی ہائی اسکول جہاں کا وہیں رہا۔ البتہ ندی کے کنارے طلبا ریت پر فٹبال کھیلنے جایا کرتے تھے۔

خانصاحب موصوف کے زمانہ صدارت کا سب سے اہم واقعہ سٹی ہائی اسکول کی موجودہ عمارت کی تعمیر سے وابستہ ہے، جگہ کا انتخاب اور تعمیر کا آغاز خانصاحب موصوف ہی کے زمانہ صدارت میں ہو گیا تھا، مگر تکمیل تعمیر سے قبل ہی ۱۳۲۹ف میں مسٹر ولنکر کی عثمانیہ کالج میں منتقلی کے بعد، جب صدر مہتمم مدارس ثانیہ کے عہدے کو تخفیف کر کے نواب مہدی یار جنگ بہادر نے اپنے زمانہ نظامت میں نائب ناظم تعلیمات کی ایک جدید خدمت کے قیام کی تحریک فرمائی تو خاں صاحب موصوف کا انتخاب اس جدید خدمت کیلئے کیا گیا اور سٹی ہائی اسکول کی صدارت پر مولوی سید محمد اعظم صاحب ایم۔ اے (کیمبرج) بی۔ ایس۔ سی (ڈبلن) وغیرہ کا تقرر عمل میں آیا صدارت پر فائز ہونے کے بعد ہی آپ نے مدرسہ کے ہر شعبہ کا تفصیلی جائزہ لیا اور فوراً ایک اسکیم مرتب فرمایا۔ جس میں نہ صرف موقتی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا بلکہ آیندہ رونما ہونے والے واقعات کو بھی ایک حد تک پیش نظر رکھا گیا۔ صاحب موصوف کی ذاتی مساعی سے اسکیم بہت جلد منظور ہو گیا۔ بوقت تقررات اضافہ اساتذہ ہی کا خیال نہیں رکھا گیا بلکہ ان اساتذہ کو بھی خاطر خواہ ترقیاں دیں جو بلحاظ اسناد نہیں تو کم از کم بلحاظ کارگزاری ہر طرح مستحق ترقی تھے۔ اپنی کشادہ نظری کے باوجود

صاحب موصوف عمارت مدرسہ کی تنگی کے باعث جماعتوں کی تعداد میں اضافہ نہ کر سکے لیکن ۱۳۳۳ف میں جب مدرسہ جدید عمارت میں منتقل ہوا تو اسکی توسیع کے مواقع نکل آئے۔ چنانچہ ایک جدید اسکیم منظور کرایا گیا جس میں مدرسہ کی جدید حالت اور بعض جدید شعبوں کے قیام کا لحاظ رکھا گیا۔ اس اسکیم کی منظوری ۳۲ سنہ ف میں حاصل ہوئی تھی۔

اس موقع پر اس امر کا لحاظ ضروری ہے کہ ناظم وقت نواب مسعود جنگ بہادر نے بھی سٹی ہائی اسکول کے قابل صدر کی وسیع النظری کا ہر طرح ساتھ دیا اور وقتاً فوقتاً جو اسکیم پیش کئے گئے انکو منظور کرنے میں کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ نواب صاحب موصوف کے بغیر کبھی یہ تعلیمی ادارہ اپنی موجودہ حالت کو نہ پہنچ سکتا تھا۔ ۳۲ سنہ ف میں سٹی ہائی اسکول کو کالج کا مرتبہ حاصل ہوا اور یہ تعلیمی ادارہ بجائے سٹی ہائی اسکول کے سٹی کالج کے نام سے موسوم کیا گیا۔ پہلے پہل سنہ مذکور میں بعض اساتذہ کو الونس لکچراری دیکر کام لیا جانے لگا۔ کیونکہ ابتدا میں صرف امتحانی طور پر انٹرمیڈیٹ کی جماعتیں قائم ہوئیں تھیں۔ لیکن ۱۳۳۳ سنہ ف میں ایک عارضی اسکیم منظور ہوا جو ۱۳۳۶ف میں مستقل کیا گیا اور چند ساعتی لکچرار کو مستقل لکچرار مقرر کر کے (۲۵۰ تا ۴۰۰) کے گریڈ میں ترقی دیگئی البتہ انگریزی کیلئے ایک اسسٹنٹ پروفیسر (۳۵۰ تا ۶۰۰) کے گریڈ کا دیا گیا۔ لیکن تاحال بعض مضامین کیلئے مستقل لکچرار نہیں ہیں طبقہ فوقانیہ کے اساتذہ ہی سے کام لیا جاتا ہے جسکے معاوضہ میں انہیں الونس ایصال ہوتا ہے۔ مولوی سید محمد اعظم صاحب کے زمانۂ صدارت میں جو اصلاحیں اور ترقیاں ہوئیں وہ اظہر من الشمس ہے صرف اس قدر تحریر کرنا کافی ہے کہ ۲۷ آذر ۲۹ سنہ ف کو صاحب موصوف نے صدارت کا جائزہ لیا اور اس وقت اسٹاف میں تین ٹرینڈ گرایجویٹ تھے اور صرف ایک ٹرینڈ ایف اے تھا کوئی ان ٹرینڈ گریجویٹ یا یم اے نہیں تھا جملہ اسٹاف بشمول اہلکار اور ایک ڈرل ماسٹر جسکی ماہوار (۱۰) تھی صرف (۳۳) اساتذہ پر مشتمل تھا، اسوقت ایک پی۔ ایچ ڈی آٹھ یم اے سات بی۔ اے ٹرینڈ آٹھ بی اے ہیں اور بشمول اہلکاران جملہ اسٹاف کی تعداد (۵۶) ہے جن میں کالج کے لکچرار شامل نہیں ہیں۔ اسٹاف کے اضافہ کی مناسبت سے طلبا کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا ہے علاوہ ازیں اسوقت وہ سارے شعبے موجود ہیں جو ایک جدید طرز کے تعلیمی ادارے کیلئے ضروری ہیں (CONVERSATIONAL CLASS) کا قیام اور مینول ٹریننگ و نباتیات کی تعلیم کا انتظام سب سے پہلے اس درسگاہ میں کیا گیا اور دوسرے مدارس اسکے تجربہ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

آخر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کالج کے اب بھی وہی لیل و نہار ہیں یعنے بازیگاہ کے معاملہ میں تاحال کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ میدان جو سٹی پولیس گرونڈ کے نام سے موسوم ہے، سٹی کالج کے طلباء کے لئے بہت موزوں ہوسکتا ہے۔ چنانچہ موجودہ صدر صاحب نے ایک بڑی رقم سرکار سے منظور کرائی اور میدان مذکور کی ناہمواری وغیرہ کو دور کرکے اسکو اس قابل بنایا کہ وہ بازیگاہ کے موزوں نام سے موزوں کیا جاسکے مگر افسوس ہے کہ سٹی کالج کا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔ صرف جناب کوتوال صاحب کے رحم وکرم پر ہمارے طلباء کے کھیلوں کا دارومدار ہے۔ بسا اوقات کوتوالی کی ضروریات کے مدنظر ہمارے طلباء کو کئی کئی روز تک میدان پر جانے کی اجازت ہی نہیں ویجاتی اور عام طور پر بھی وقت کا تعین کردیا جاتا ہے۔ اگر مقررہ وقت طلباء کے لئے موزوں ہو تو کوئی دوسری صورت نہیں نکل سکتی۔ باوجود اس کے سٹی کالج ہر کھیل میں حصہ لیتا ہے اور ان درسگاہوں سے کسیطرح کم نہیں ہے جو بازیگاہ کے معاملہ میں زیادہ خوش نصیب واقع ہوئے ہیں۔



تاثراتِ صبحگاہی

از

سیّد علی حسنین صاحب زیباؔ ام اے (عثمانیہ)

سحر کی تاریک روشنی میں ستارہ اک جگمگا رہا ہے — مری مژہ پر ہے اک ستارہ جو آنکھ اس سے ملا رہا ہے

سکون سا دل کو مل رہا ہے سرور سا مجھ پہ چھا رہا ہے — تمام عالم کو آزما کے وہ اب مجھے آزما رہا ہے

فضا پہ چھائی ہوئی خموشی مرا دل مضطرب بھی ساکن — ستارۂ صبح مجھکو ایسے میں راز ہستی بتا رہا ہے

وہ منظرِ کوئے دوست اے دل وہ تیری حیرت فروش جنت — ستم ہے ظالم کہ یہ سماں بھی جھلک اسی کی دکھا رہا ہے

خدا ہی اس راز سے ہے واقف کسی کا دل ہے کہ رشک شبنم — پڑا ہے سبزہ پہ ایک موتی جو دیر سے تلملا رہا ہے

افق پہ بجلی ٹھہر گئی ہے لکیر سی نور کی کھنچی ہے — نظر میری مجھ سے کہہ رہی ہے کہ یہ کوئی مسکرا رہا ہے

فضا میں کچھ رنگ بھر رہے ہیں ہزاروں جلوے نکھر رہے ہیں — الٰہی یہ کون رفتہ رفتہ نقاب رخ سے ہٹا رہا ہے

سحر کے جوہر سمٹ رہے ہیں نظر سے پردے الٹ رہے ہیں — کرن ہے یہ یا کوئی فرشتہ پیام فطرت کا لا رہا ہے

شب جدائی نے منہ پھرایا سحر کا قاصد پیام لایا — پیام لایا کہ رونے والے وصال کا دن بھی آ رہا ہے

اگرچہ دل اور فسردہ دل کی مثال پر پھول کے نظر ہے — مگر اسی دل کو پھول اس دم شگفتہ ہونا سکھا رہا ہے

پریم نگری سے آ رہی ہے یہ کیسی ٹھنڈی ہوا کہ زیباؔ

وہ ابھی تک نڈھال تھا جو خوشی کی ہنسی بجا رہا ہے

انجمن طلبائے قدیم سٹی ہائی اسکول کی تشکیل

از

مولوی عبدالجبار صاحب بی اے ال ال بی

فنی حیثیت سے تاریخ کی تعریف جو کی جاتی ہے اس کے لحاظ سے بہت کم ایسے واقعات رہ جاتے ہیں جنکی نسبت تاریخ لکھی جاسکتی ہے۔ اس کے برخلاف عرف عام میں ہر ایسے واقعہ کی تاریخ لکھی جاسکتی ہے جو کسی نہ کسی زمانہ سے تعلق رکھے اور کینٹ کے مشہور اصول فلسفہ کے اعتبار سے تو ہر واقعہ زمان و مکان کے قیود کا پابند ہے، اس لئے ہر واقعہ کی تاریخ ہوسکتی ہے۔ ہمارا مسلک مضمونِ زیرِ عنوان لکھنے میں ان دونوں انتہائی عالمانہ اور عامیانہ صورتوں کے بین بین ہے۔

انجمن طلبائے قدیم، اساتذۂ فن تاریخ کی نظر میں اس زمرۂ واقعات میں داخل نہ صحیح جو لایق تاریخ نگاری ہوں مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ روزمرہ کے کسی بھی واقعہ سے ممیز ضرور ہے۔ دور حاضرہ کی ایک اہم خصوصیت تنظیم ہے اور تنظیم وہی استوار و مضبوط ہوتی ہے جو کئی وحدتوں پر مشتمل ہو جن میں سے ہر ایک بجائے خود مستحکم ہو لیکن شرط یہی ہے کہ یہ وحدتیں اپنی تعدد و تنوع کے باوجود بحیثیت ایک کل کے اجزا ہونے کے آپس میں متحد و متعاون ہوں اور یہی فطرت کا اصول ہے۔ چنانچہ کان، آنکھ کا غیر، ہاتھ پاؤں کا غیر، منہ ناک کا غیر، ان میں سے ہر ایک عضو اپنی علیحدہ علیحدہ

فعلیت رکھتا ہے مگر انسانی عضویت کے لئے سب یکساں طور پر ممد و معاون ہیں، اس خصوص میں ایک کو دوسرے سے حاشا پرخاش نہیں۔ اسی طرح تنظیم کلی کے مدنظر انجمن طلبائے قدیم بھی ایک وحدت ہے اس کے علاوہ اگر اس کے مقاصد پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اپنی آپ مدد جو اس کا اساسی اصول ہے ضرور اسکو اس قابل بنا دیتی ہے کہ اس انجمن کی تشکیل کی تاریخ لکھی جاے اور اسکی کارفرمائیاں قلم بند ہوں تاکہ آنے والوں کیلئے رہنمائی ہو اور پچھلوں (گذشتہ لوگ) کے بہتر خیالات سے تمتع اور اچھے عمل کے تتبع کا موقعہ حاصل رہے۔

مزید بریں انجمن طلبائے قدیم کی اہمیت کا تصور اور پھر اس انجمن کی تاریخ کی ضرورت اس امر سے واضح ہوگی کہ ہر ملک کی ایک مخصوص تربیت (CULTURE) ہوتی ہے وہ کلچر اس ملک کے علمی اداراہیں نشو و نما پاتا ہے اور انجمن طلبائے قدیم اپنے متعلقہ علمی ادارات کا ایک جزو لاینفک ہوتی ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں دنیا کے ممالک میں اس مخصوص تربیت کی تشکیل میں بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے، یورپ میں مادیت چھائی رہی، ایشیا کے وہ ممالک جو مایۂ ناز تربیت یا کلچر رکھتے تھے اپنی داخلی و خارجی مشکلات کے مدنظر خاطر خواہ توجہ اپنے کلچر کی سنبھال کی طرف نہ کرسکے، ہندوستان اغیار کی اثر افگنی میں مبتلا رہا۔ ایسے نازک دور میں حیدرآباد فرخندہ بنیاد ان تمام مضر اثرات سے ایک گونہ مامون و مصئون رہا۔ اور اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ اس کا اپنا —— کلچر —— نسبتاً زیادہ محفوظ رہا۔

مختلف ممالک کے کلچر باہم مختلف ہوتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جرمنی میں فکر کیجیے، انگلستان معاملات کی جگہ ہے، اور ہندوستان مذاہب کا گہوارہ ہے وغیرہ کلچر یعنی تربیت کی نشو و نما اور اسکی ترقی جیسا اوپر مذکور ہوا علمی ادارات میں ہوتی ہے۔ علمی ادارات کے اختلاف کے ساتھ ساتھ اس ترقی کی کیفیت اور مدارج بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ہر ایک علمی ادارہ اپنے متبعین میں ایک خاص قسم کا کیرکٹر پیدا کرتا ہے آکسفورڈ یونیورسٹی کی پیداوار نسبتاً زیادہ قدامت پسند و شاہ پرست واقع ہوئی ہے، انمیں بہت کم (انقلابی) ہوتے ہیں

اجتماعی کردار کی ترقی کے لئے ایک مربوط سلسلہ کی ضرورت ہے۔ جتنا سلسلہ طویل ہوگا اتنا ہی وہ زیادہ مستحکم اور اذہان پر اس کا قابو زیادہ ہوگا، ورنہ ترقی کردار کی کوششوں کے چیدہ چیدہ نتائج ہونگے جو کم و بیش

انفرادی کمالات سے زیادہ خصوصیت نہیں رکھتے۔ اس سلسلے میں مثال کے طور پر اسی درسگاہ کے جس کی انجمن طلبائے قدیم کی نسبت یہ چند سطور لکھے جا رہے ہیں، بعض تربیت یافتہ اور مستفید شدہ مایۂ ناز ہستیوں کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ انجمن کے اولین صدر جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی علمی قابلیتوں اور ادبی کارناموں سے قطع نظر انکی ذاتی خصوصیات، ہر اپنی چیز سے غیر جنبہ دارانہ واجبی طور پر لگاؤ، سوسائٹی میں ہر انسان کے موافق و مخالف کردار کے صحیح اندازے کے بعد اسکی جگہ کا قرارداد، جو بڑی حد تک انکی ابتدائی درسگاہ کی تربیت کا نتیجہ ہیں ضرور بہ طور نمونہ استفادہ و تقلید کے قابل تھے اور ہیں۔ انجمن کے حالیہ صدر جناب مولوی سید خورشید علی صاحب کی قابل قدر ہمدردانہ خوش اخلاقی جس نے سوسائٹی کو گرویدہ کر رکھا ہے اور انکی قابلیت حسن تنظیم جسکی بدولت اکثر اہم ادارات نے ان کے زیر انتظام نہایت نمایاں ترقی کی ہے منجملہ دیگر خصوصیات کے ایسی قابل تقلید خصوصیتیں ہیں کہ جن سے گذشتہ یا حال طالب علموں کو استفادہ یا اثر پذیری کا موقعہ ملتا تو یقین ہے کہ نہایت بہتر اور خوش گوار نتائج مرتب ہوتے اور فی زمانہ جبکہ تنظیم کی سخت ضرورت ہے ملک و قوم کو فائدہ پہونچتا۔ اسی طرح جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) اپنی ادبی خدمت گزاری کے تمام شوق کے ساتھ صرف چند تصنیفات کے مصنف بن سکے ورنہ ان کا "مصنف گر" بننا ممکن تھا (جسکی اب انسے بہ حیثیت پروفیسر بجا طور پر توقع رکھی جا سکتی ہے) اور یقین تھا کہ اس مضمون کے لئے لکھنے والے کو اس قدر اصرار کے ساتھ مجبور کرنے کی شاید ضرورت پیش نہ آتی۔ اسی سلسلہ میں ڈاکٹر غلام محی الدین صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی (جرمنی) کی علو ہمتی اور خود اعتمادی کا سایہ اگر کسی پر پڑتا تو بلا شبہ آج ملک میں محض طالب علمانہ کیفیت و طالب علمانہ ماحول میں اپنے سوا کسی دوسرے پر تکیہ کئے بغیر سات سمندر پار جا کر تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد ہم میں ایک سے زیادہ ہوتی اور جس سے زندگی کی دوسری روشوں میں بھی زبردست فائدہ اٹھایا جا سکتا۔ ایک درسگاہ میں جو کردار پیدا ہوتا ہے اس کا سلسلہ اسی طرح سے قایم ہو سکتا ہے کہ اس کے طلبائے قدیم و حال میں ایک مسلسل ربط قایم رہے جس کے لئے واحد رابطہ انجمن طلبائے قدیم ہی ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر الما لطیفی صاحب، خان فضل محمد خان صاحب، اور سید محمد اعظم صاحب کی حسن مساعی سے

اگرچہ سٹی ہائی اسکول کی مشکلات، موزوں عمارت کے فقدان اور کمی وسعت وغیرہ دور ہو چکی تھیں۔ اور اسکی ضروریات بزم ادب کا قیام، جسمانی تربیت اور مختلف کھیلوں کا انتظام وغیرہ میسر ہو چکے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک مکمل درسگاہ ہے لیکن پھر بھی اس تصورکمال کی تکمیل کے لئے ایک چیز مفقود تھی یعنے اس درسگاہ میں انجمن طلبائے قدیم عدم موجود تھی۔ اس ضرورت کو بعض اصحاب ضرور محسوس کرتے تھے اور بعض حضرات اس سے بڑھ کر کچھ ارادے اور منصوبے بھی رکھتے تھے لیکن یہ سب بالقوۃ تھے۔ عام قاعدہ کے تحت بالقوۃ کو بالفعل ہونے کے لئے ایک محرک کی ضرورت ہے اور یہ محرک قیام انجمن طلبائے قدیم سٹی ہائی اسکول کی صورت میں مسٹر کودن رام راؤ کے روپ میں رونما ہوا۔ یہ محترم دوست، برادر مدرسہ یعنی قدیم طالب علم ہیں، رفع ضروریات کے لئے نہایت محدود ذرائع رکھتے تھے، فوقانیہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کسی فنی تعلیم کی طرف رجوع ہوئے۔ کالج کی شرکت، ضروریات آلات اور مقررہ نصاب کی فراہمی، یہ تھے وہ سخت مشکلات جو درپیش تھے۔ ان کے خلوص اور شوق نے ان کو ایک ایسے مرجع تک پہونچایا۔ جو علم دوست، ہمدرد اور حقیقی مصیبت کے وقت مددگار ہے، اور جہاں ایک ضرورت مند کی ضرورت رفع ہونے کے بعد اس امر پر غور ہونے لگا کہ چند دیگر حاجت مندوں کی حاجات پوری کرنے کا کون مناسب طریقہ ہو سکتا ہے کیونکہ استمداد کی انفرادی کوشش اور اجتماعی مساعی میں فرق ہونا لازم ہے۔ جناب ممدوح کے ہمیشہ کے اصرار اور خواہش کی متابعت میں میں عدم اظہار نام کا پابند ہوں لیکن اس سے مضمون کے طویل ہونے اور اس کی وضاحت میں خلل واقع ہونے کا اندیشہ ہے، اس لئے مجبور ہوں۔ الحاصل مسٹر کودن رام راؤ اور مولوی سید خورشید علی صاحب کا ملنا ایک کو درجہ تعلیم سے فراغت کے بعد آگے تعلیم پانے کا مسئلہ درپیش، مشکلات حاضرہ کی بھیانک تصویر روبرو، ایک طرف خودداری و مجبوری اور دوسری طرف ہمدردی و امداد بخشی، یہ تھا وہ ماحول جس میں ایک اجتماعی وحدت کے قیام کا تصور پیدا ہوا۔ اس خیال کی تکمیل کی صورت بہ تعلق تصورات حاضرہ سوائے انجمن طلبائے قدیم سٹی ہائی اسکول کے قیام کے اور کچھ نہیں ہو سکتی تھی۔

اس ضرورت کا احساس اول ہی سے موجود تھا۔ جب مسٹر کودن رام راؤ نے اس تحریک کا تذکرہ کیا تو نہایت گرمجوشی سے لبیک کہا گیا۔ ان دنوں جناب لائق علی خاں صاحب انجنیر۔ جناب قطب الدین صاحب فاری

پروفیسر۔ جناب رضا محمد خاں صاحب مصنف اور یہ راقم السطور، ثانوی تعلیم ختم کرکے اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مصروف تھے۔ افضل گنج بس روڈ کی ابتدا پر جہاں اب تعمیرات کے نئے اصول کے مطابق سیمنٹ کے ستونوں پر سٹی کالج کا دارالاقامہ قائم ہے اور جو میر لائق علی صاحب کی مملوکہ جائداد ہے وہیں ان کا ایک مکان تھا جو انکا مسکونہ بھی تھا جہاں مذکورہ چار یار کی اکثر یک جائی رہتی تھی جب یہ تحریک ہم تک پہونچی تو فوراً ہم سب اس کو روبہ عمل لانے تیار ہوگئے۔ ہم سبھوں کے ایک اچھے دوست اور قدیم ساتھی جناب محمد عبد القیوم خاں صاحب انجنیر تھے جنہوں نے فنون میں اعلیٰ تعلیم علیگڈھ کالج میں حاصل کی تھی۔ چونکہ علیگڈھ کالج کی انجمن طلبائے قدیم کی خاصی شہرت تھی اسلئے یہ مناسب سمجھا گیا کہ اس معاملہ میں صاحب موصوف سے گفتگو کی جائے۔ جنہوں نے علیگڈھ کی انجمن کے حالات و خصوصیات بیان کیں اور قیام انجمن طلبائے قدیم سٹی ہائی اسکول کے باب میں ہمارے مطلق ہم آہنگ ہوے۔ اسطرح کچھ دن غور و خوض کے بعد ایک سرسری خاکہ کے ساتھ ہم چند احباب مسٹر گوون رام راؤ کی معیت میں مولوی سید خورشید علی صاحب کے پاس پہونچے، جہاں نہ صرف انکی پہلی ملاقات سے نہایت مسرت حاصل ہوی بلکہ اس تحریک کے سلسلہ میں ہم سب کے ارادوں میں تقویت پیدا ہوی اور جناب ممدوح کے گزشتہ تجربوں کی بنا پر مختلف ہدایات کے سبب عملی کام میں بے حد سہولت ہوی۔ اس کے بعد باہمی مشاورت میں یہ بھی ضروری قرار پایا کہ جناب سید محمد اعظم صاحب ایم اے سے بہ تعلق مدرسہ اور اس سے بڑھ کر ان کے معلومات جدیدہ، روشن دماغی اور اس قبیل کے اُروپی تجربات سے فائدہ اٹھانے مشورہ کیا جائے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان کے زرین مشورے اس ابتدائی نوبت پر اس معاملہ میں بلاشبہ بہترین رہنما ثابت ہوئے۔

قیام انجمن کا مسئلہ جب بالکل طے ہوگیا اور اس حد تک کارروائی تکمیل پا چکی تو مقامی اخبارات کے ذریعہ ایک جلسہ کا اعلان کیا گیا جس کی غرض اس تجویز کے عملی پہلو پر غور کرنا تھا۔ یہ جلسہ اوائل ماہ اکٹوبر ۱۹۲۲ء عیسوی میں سٹی ہائی اسکول کی نو تعمیر عمارت کے بڑے ہال میں منعقد ہوا۔ توقع سے زیادہ کافی تعداد میں طلبائے قدیم جمع ہوئے یہ غلبہ آرا، جناب محمد عبد القیوم خاں صاحب نے جلسہ کی صدارت فرمائی۔ انجمن طلبائے قدیم کی اہمیت اور انجمن طلبائے قدیم سٹی ہائی اسکول کے قیام کی ضرورت پر پُرجوش تقریریں ہوئیں، مقررین کی تعداد دس بارہ سے زیادہ تھی

اثنائے کارروائی جلسہ میں صدر موصوف نے ایک سے زیادہ مرتبہ حاضرین کو موضوع کی مخالفت میں اگر چاہتے ہوں تو تقریر کرنے کی دعوت دی لیکن کسی شخص کی بھی ایسی خواہش ظاہر نہیں ہوئی۔ ختم تقاریر پر جمیع حاضرین نے متفقہ طور پر بلا اختلاف احیاء انجمن طلبائے قدیم سٹی ہائی اسکول کے قیام کی تجویز کو نہایت مسرت کے ساتھ قبول و پسند کیا۔ اور جناب محمد عبد القیوم خاں صاحب کو غالب اکثریت کے ساتھ دستور کے طے پانے تک اجرائے کار کے لئے معتمد مقرر کیا گیا اس طرح ڈھائی گھنٹہ تک کارروائی کے بعد جلسہ ختم ہوا۔ جلسہ کی اس کامیابی پر اطمینان ہوا اور یہ معلوم کرکے طلبائے قدیم سٹی ہائی اسکول نے ہماری صدا پر نہایت جوش سے لبیک کہا اور اس تجویز سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ حاضرین میں بعض حضرات ایسے بھی تھے جن کو اس مدرسہ سے فیض کام ہوکر بیس بیس پچیس پچیس سال کا عرصہ ہوا تھا۔ اس کے بعد ایک غیر دستوری منتخبہ مختصر کمیٹی کے ذریعہ اس خیال کی نشر و اشاعت کی گئی اور اس تجویز کو طلبائے قدیم میں عام کیا گیا۔ بالآخر ۲۴ نومبر ۱۹۲۲ عیسوی کو اسی مقام پر ایک عام جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت محترم برادر مدرسہ جناب مرزا محمد علی بیگ صاحب ایم اے نائب ناظم جنگلات سرکار عالی نے فرمائی۔ قیام انجمن طلبائے قدیم سٹی ہائی اسکول کا رزولیوشن بہ اتفاق آرا منظور ہونے کے بعد عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا جنکی اجتماعی ہیئت مجلس انتظامی کے نام سے موسوم کی گئی۔ مجلس انتظامی، منتخبہ کمیٹی کے مرتبہ اور جلسۂ عام کے منظورہ قوانین و قواعد کے تحت، دستور و آئین کے مطابق حسب ضابطہ مصروف کار ہوئی۔

یہ ہیں چند واقعات جو انجمن طلبائے قدیم سٹی ہائی اسکول کی تشکیل میں پیش آئے۔ رہیں انجمن کی کارروائیاں سو اس کی سالانہ رپورٹوں کے ملاحظہ سے واضح ہونگی۔ اس مضمون میں اس تفصیل کی گنجائش نہیں۔

انجمن طلبائے قدیم سٹی کالج کی تاریخ

از

پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب ایم اے ال ال بی

انجمن طلبائے قدیم سٹی کالج، جس کا قدیم نام انجمن طلبائے قدیم سٹی ہائی اسکول تھا "بالفعل" ۲۰ نومبر ۱۹۲۲ء کو وجود میں آئی۔ اس تاریخ طلبائے قدیم کا پہلا اجتماع ہوا جس میں انجمن کی تشکیل کے تمام امور طے پائے۔ قواعد مرتب ہوئے اور عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا "بالفعل" اس لئے کہ اس تاریخ سے تقریباً دو تین مہینے پہلے ہی یہ "بالقوی" موجود تھی۔ طلبائے قدیم کیلئے ایک انجمن کی ضرورت کا احساس بعض طلبائے قدیم کو ہو چکا تھا جنمیں مولوی سیّد خورشید علی صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں اس خیال کے پیدا ہو جانے کے بعد اسکی نشر و اشاعت، اور ابتدائی امور کے انصرام میں سب سے زیادہ دلچسپی جن حضرات نے لی ان میں مسٹر کودن رام راؤ کا نام سب سے پہلے لیا جائیگا قیام انجمن کی تجویز پر غور و خوض کرنے کے لئے سب سے پہلی نشست طلبائے قدیم کی اوائل ماہ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں ہوئی۔ جسکی تکمیل کے ذمہ دار مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ ایک اور قدیم طالب علم مسٹر عبدالقیوم خاں بی، ایس سی (علیگ) بی ایس سی (مانچسٹر) ہیں خاں صاحب ہی اس جلسے کے صدر تھے اور پھر اس انصرامی مجلس کے معتمد بھی منتخب ہوئے جو اس جلسے نے مرتب کی تھی۔ انصرامی مجلس ہی درحقیقت انجمن کی طرح انداز ہے۔ اسی نے اپنی طویل نشستوں میں

گرماگرم بحثوں کے بعد اسکی ہئیت معین کی۔اور اس کے ارکین کی سعی سے ابتدائی قواعد مرتب ہوئے۔ ۲۰ہر نومبر ۱۹۲۲ء کا پہلا جلسۂ عام بھی اسی مجلس کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

۲۰ہر نومبر ۱۹۲۲ء کے جلسۂ عام میں حسب ذیل عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی ام اے پی ایچ ڈی — نائب صدر جناب مولوی سید خورشید علی صاحب

معتمد جناب مولوی عبدالقیوم خاں صاحب — شریک معتمد جناب مولوی خواجہ معین الدین صاحب انصاری

خازن۔جناب مولوی کریم اللہ خاں صاحب

اراکین۔ (۱) جناب مولوی سید احمد محی الدین صاحب مدیر رہبر دکن (۲) مولوی اکبر علی خاں صاحب (۳) مولوی صلاح الدین صاحب (۴) مولوی سید معین الدین صاحب قریشی (۵) مولوی سید محمد مہدی صاحب (۶) مسٹر جی، پی بھان (۷) مولوی غلام قادر صاحب (۸) مولوی میر لیاقت علی صاحب۔ (۹) مولوی رضا محمد خاں صاحب (۱۰) مولوی سید عبدالجبار صاحب (۱۱) مولوی عبدالرزاق صاحب ایچ، سی، ایس (۱۲) مولوی ابراہیم احمد صاحب رضوی۔

پرنسپل مدرسہ جناب سید محمد اعظم صاحب کو اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل سے بڑا اطمینان حاصل ہوا جس کا اظہار موصوف نے ہر قدم پر انجمن کی مدد کے ذریعہ فرمایا۔

نوزائیدہ انجمن کی اس اولیں وزارت نے، بہت کچھ تعمیری کام انجام دیا۔جو ادارے اور طلبائے قدیم دونوں کے لئے کسی نہ کسی حیثیت مفید ہے۔تعلیم کی تزئین اور تہذیب اخلاق میں کھیلوں کی بڑھتی ہوی اہمیت کے مدنظر، وزارت نے اپنے اولیں اجتماع میں مسٹر خلیل الرحمن کو انجمن کے شعبۂ تفریحات کا معتمد منتخب کرکے ممکنہ اور موزوں کھیلوں کا انتظام ان کے سپرد کردیا اور صدر کابینہ جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی نے اس کام کو آسان بنانے کے لئے (صہ) کا گراں قدر عطیہ مرحمت فرمایا۔غیر مستطیع طلبا کی امداد کے لئے اس نے ایک علمی اور صحت بخش ضابطہ تیار کیا۔اور طلبائے قدیم کے کثیر ترین اجتماع کے امکان اور غیر کاروباری ارتباط کو ترقی دینے کے لئے عصرانہ منعقد کئے

بہ حیثیت اولیں وزارت کے ضوابط انجمن کی طباعت اور اشاعت کا فریضہ بھی اس کے ذمہ تھا۔ اس وزارت کے ایک باہمت رکن مولوی سید احمد محی الدین صاحب مدیر" رہبر دکن" نے اپنے ذاتی صرفے سے ضوابط کے ایک ہزار نسخوں کی طباعت کا انتظام کر دیا۔

اس عہد وزارت کے بعض اہم واقعات ایک خاص "ایٹ ہوم" اور شکسپیر کے ایک انگریزی ڈرامے کی پیش کشی ہے۔"ایٹ ہوم" چند طلبائے قدیم کی روانگی یورپ کے موقع پر انجمن کی طرف سے دیا گیا۔ ان طلبا میں وزارت کے سرگرم رکن اور معتمد مولوی عبدالقیوم خاں صاحب بھی شامل تھے۔ جن کو اپنے عہدہ سے مجبوراً مستعفی ہونا پڑا۔ خاں صاحب کی جگہ مولوی عبدالجبار صاحب کا انتخاب عمل میں آیا۔

انجمن کے بیسیوں انتظامی اور انصرامی کاموں کے علاوہ سب سے زیادہ ہمت آزما فرض اس وزارت کے سامنے فراہمی چندہ اور رقوم کا تھا۔ جس کو ارکین وزارت نے قابل رشک طریقہ پر انجام دیا۔ چنانچہ فروری ۳۳ فصلہ میں جب اپنی عمر کا سال ختم کر کے یہ رخصت ہونے لگی تو اس نے تقریباً چھ سو روپیہ کا ترکہ چھوڑا۔ جس سے آجتک انجمن متمتع ہو رہی ہے۔ ایک نوزائیدہ انجمن کی یہ رفتار ترقی ہر آئینہ امید افزا ہے

دوسری کابینہ نے ماہ فروری ۱۳۳۳ف میں جائزہ حاصل کیا یہ حسب ذیل حضرات پر مشتمل تھی۔

صدر۔ جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی۔ ام اے پی اچ ڈی صدر شعبہ عربی الہ آباد یونیورسٹی

نائب صدر۔ جناب مرزا محمد علی بیگ صاحب، نائب ناظم جنگلات

معتمد۔ جناب سید معین الدین قریشی صاحب۔ ام اے

شریک معتمد۔ جناب احمد حسین خاں صاحب

خازن۔ جناب کریم اللہ خاں صاحب بی اے، بی ٹی، مددگار سٹی کالج۔

ارکین

(۱) جناب میر سیادت علی خاں صاحب ام اے ال ال بی پی اچ ڈی۔ بی سی ایل، پروفیسر قانون جامعہ عثمانیہ

(۲) جناب قطب الدین صاحب بی اے، (عثمانیہ) بی اے (مصر) مددگار پروفیسر اخلاقیات کلیہ جامعہ عثمانیہ

(۳) جناب بشارت اللہ صاحب (۴) جناب سید محمد صفی صاحب بی اے۔ محکمۂ نظامت تعلیمات سرکار عالی

(۵) جناب نصیر احمد صاحب (۶) جناب سعید احمد خاں صاحب مددگار سٹی کالج

(۷) جناب رضا محمد خاں صاحب بی اے ال ال بی منصف

(۸) جناب مولوی سید خورشید علی صاحب ناظم دفتر دیوانی و مال سرکار عالی

(۹) جناب عبدالستار صاحب نائب ام اے ال ال بی رکن دار الترجمہ

(۱۰) جناب احمد محی الدین صاحب مدیر "رہبر دکن"

(۱۱) جناب خواجہ معین الدین صاحب انصاری مددگار فینانس

(۱۲) جناب رشید احمد صاحب بی اے، رکن دار الترجمہ

نئی کابینہ نے قلمندان وزارت سنبھالنے کے بعد، نہایت سرگرمی سے کام شروع کیا اور بعض وقت طویل طویل نشستوں میں انجمن سے متعلق خشک اور صبر آزما انتظامی امور طے کئے گئے۔ جن میں انجمن کے رقمی انتظامات، خارج شدہ اراکین انتظامی کی جگہ نئے انتخابات، لائحہ عمل پر غور و خوض اور امدادی فنڈ کی تنظیم اور توسیع خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اسکی توجہ تمام تر انتظامی امور پر صرف ہوئی۔ اس زمانہ میں جناب خان فضل محمد خاں صاحب (نائب ناظم تعلیمات) سابق صدر مدرسہ برطانوی ہند میں اپنی اصلی خدمت پر واپس تشریف لے گئے۔ کابینہ نے بہ شرکت سررشتۂ تعلیمات انجمن کی طرف سے ایک وداعی "ایٹ ہوم" ترتیب دیا تھا۔ اسکے علاوہ کوئی اور عام مفاد کے کام انجام دینے کا اسکو موقع نہ ملا۔ غالباً بعض کارکن عہدہ داروں کی، دوسری مصروفیتوں کے سبب یا عام طلبائے قدیم کی طرف سے ہمت افزا اشتراک عمل کے فقداں کے باعث، جو زیادہ تر چندوں کی فراہمی میں ظاہر ہوتی ہے۔ یا پھر ضوابط انجمن میں نصاب مجلس انتظامی کی غیر معمولی سختی کی وجہ سے جو عدم تکمیل نصاب میں جلسوں کی برخاست سے ظاہر ہوئی اور جس کے خلاف اگلی وزارت نے بھی کئی دفعہ صدا بلند کی تھی، وزارت پر پانچ مہینے کے بعد ایک طویل جمود چھا گیا۔ اور انجمن کے کاروبار تعطل کی حالت میں پڑے رہے۔

۱۸؍اسفندار ۱۳۴۲ف کو کامل دس سال کے بعد کابینہ کی سعی سے انجمن کا از سر نو احیا ہوا۔ سٹی کالج کے ''گریٹ ہال'' میں جمع ہو کر جلسۂ عام نے حسب ذیل ارکان کی ایک وزارت ترتیب دی۔

صدر - جناب مولوی سید خورشید علی صاحب ناظم دفتر دیوانی و مال و ملکی وغیرہ سرکار عالی۔

نائب صدر - جناب عبدالقیوم خاں صاحب بی، اس، سی (انجنیئر) مددگار انجنیر

معتمد - جناب سید محمد صفی صاحب بی، اے محکمۂ نظامت تعلیمات سرکار عالی

شریک معتمد - مسٹر جی۔ بی۔ بھان۔ مددگار سٹی کالج

معتمد تفریحات جناب سعید احمد خاں صاحب مددگار سٹی کالج

خازن - جناب کریم اللہ خاں صاحب بی اے، بی ٹی۔ مددگار سٹی کالج

ارکین

(۱) جناب خواجہ معین الدین صاحب انصاری۔ ایچ سی ایس

(۲) ،، ڈاکٹر میر سیادت علی خاں صاحب ام، اے ال ال، بی، ڈی، فل۔ بی سی ال پروفیسر قانون جامعہ عثمانیہ

(۳) ،، ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور، ام اے، پی ایچ، ڈی، پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ

(۴) مسٹر رام لال۔ بی اے، مددگار سررشتۂ مالگزاری

(۵) مسٹر ترمبک لال جاگیردار

(۶) جناب احمد محی الدین صاحب ''مدیر رہبر دکن''

(۷) جناب غلام قادر صاحب بی اے۔ وائس پرنسپل سٹی کالج

(۸) جناب معین الدین قریشی صاحب ام، اے۔

(۹) جناب عبدالرب صاحب (دفتر دیوانی، ملکی و مال وغیرہ) ملکی و مال

(۱۰) جناب سید عبدالجبار صاحب بی اے۔ ال ال بی

(۱۱) جناب احمد علی خاں صاحب ام اے، ال ال بی،

(۱۲) عبدالقادر سروری

لیکن ان میں سے، جناب انصاری صاحب، مولوی احمد محی الدین صاحب اور احمد علیخاں صاحب نے اپنی سرکاری اور خانگی مصروفیتوں کے سبب استعفا دیدیا اور انکی جگہ حسب ذیل حضرات کا انتخاب عمل میں آیا۔

(۱) جناب عبدالرؤف صاحب بی اے ال ال بی، وکیل ہائیکورٹ

(۲) جناب سید محمد صاحب ام، اے مددگار سٹی کالج

(۳) جناب مرزا محی الدین بیگ صاحب بی اے

نئی وزارت کو کاروبار ہاتھ میں لئے ہوئے تقریبًا آٹھ مہینے ہوئے۔ اس دوران میں بہت سے انتظامی معاملات کا تصفیہ ہوا۔ جن میں سب سے اہم، قواعد انجمن کی از سر نو ترتیب ہے۔ اس کے علاوہ ہائی اسکول لیونگ سارٹیفکٹ کے امتحان اور عثمانیہ میٹرکیولیشن کے امتحان میں اول آنے والے طلبہ کے لئے پچاس روپیہ کے دو انعام مقرر ہوئے ہیں جو جناب صدر صاحب سٹی کالج کی صوابدید سے روپیہ یا کسی عطیہ کی شکل میں دیئے گئے۔ ملک اور اضلاع میں پھیلے ہوئے قدیم طلبہ کے درمیان رابطہ کے لئے ایک علمی اور طلبائے قدیم سے متعلق ضروری اور دلچسپ امور پر مشتمل پرچہ بھی بڑی محنت سے شایع کیا گیا جو توقع ہے کہ اپنی خصوصیات کی بدولت ملک اور بیرون ملک میں پسند کیا جائے گا۔ تمام قدیم طلبہ کو سال میں کم سے کم ایک دفعہ ایک جا جمع کرنے کے لئے، ایک معاشرتی جلسے اور ایک ڈنر کی تجویز بھی منظور ہوی۔ ان تمام انتظامات میں عہدہ داران انجمن نے جس دلچسپی کا اظہار کیا وہ بہر حال قابل تحسین ہے



رُودِ موسیٰ کو طغیانی میں دیکھ کر

از

صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب

(۱)

رُودِ موسیٰ! کون تیری راہ میں حائل ہوا
لب پہ آوازِ غضب ہے تیوریوں پر بل بھی ہے

کیوں خرامِ ناز سے ظاہر ہیں محشر خیزیاں
ہر ادائے فتنہ ساماں قہر پر مائل بھی ہے

(۲)

دے رہی ہیں پُرسکوں دنیا کو پیغامِ فنا
لے رہی ہیں کروٹیں بربادیاں آغوش میں

کوندتی ہیں اُٹھتی موجوں میں قضا کی بجلیاں
بے قراری مضطرب ہے اضطرارِ جوش میں

(۳)

ہر وفا نا آشنا انداز میں ہے تمکنت
ہو گیا ہے دہشت آگیں جذبۂ جوشِ جنوں

ہر رگِ بسمل میں ہیں بے تابیِ قت سوزیاں بن گیا ہے آتشِ سیال خشم آلود خوں

(۴)

ہیں فنائے شور و شر صبر آزما خاموشیاں لب کشائی پر ہے آمادہ سکوت بے قرار
ہر تڑپ شرمندۂ طوفانِ محشر ساز ہے ہر تھپیڑا ہے جلالی شان کا آئینہ دار

(۵)

چشمِ خونیں میں نظر آتا ہے پُر اسرار طیش لہریاں لیتا ہے چہرے پر غبار آلود عتاب
بے قراری میں سکوں پاتا ہے تخئیلِ عمل پیچ و خم کھاتا ہے قالب میں ہجوم اضطراب

(۶)

جو بھی آتا ہے فنا ہوتا ہے ذرہ ہو کہ سنگ "حوصلہ افزا قیامت" کی جھلک پانی میں ہے
مل رہا ہے درسِ عبرت چشمِ بینا کیلئے
انقلابِ دہر کی تفسیر طغیانی میں ہے



تحریکاتِ جدید اردو ڈراما

اور

حیدرآباد دکن

از

پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب۔ ام اے۔ ال ال بی

ڈراما یعنے نظم یا نثر میں لکھے ہوے وہ قصے، جو لکھنے والے کی تشریحات کے بغیر، خود اشخاص قصہ کے قول، فعل اور اداکاری کے ذریعہ پیش کئے، یا دوسرے الفاظ میں، اسٹیج پر دکھائے جاتے ہیں۔ مشرق، خصوصاً ہندوستانی ادب کے ساتھ قدیمی ربط رکھتے ہیں۔ سنسکرت کے قدیم ترین فوق الفطرت یا حقیقت پر مبنی ناٹک، مغرب کے ترقی یافتہ ڈراموں کے مقابلے میں بھی آج تک لازوال اہمیت کے مالک ہیں۔ ساری قوموں میں یہ طریقہ رائج تھا کہ وہ اپنے سورماؤں کے حالات، لوگوں کے مجمع میں اونچے ٹیلوں سے اداکاری کے ذریعہ دکھایا کرتے تھے لیکن اردو میں، مسلمان مصنفین کے مخصوص معتقدات نے انہیں نہ تو سنسکرتی ڈراموں کو اختیار کرنے دیا اور نہ قدیم عربوں کے طریقے کو ترقی دینے کی طرف مائل کیا، ہندو مصنفین کے لئے یہ کام ممکن تھا لیکن انہوں نے بھی خود اپنے قدیم فن کو رائج کرنے کی کم کوشش کی کیونکہ فارسی زبان، جو اس زمانہ میں ہندوستانی ادب کیلئے الہام بنی ہوئی تھی، اس صورت

ادب سے نا مانوس تھی۔ یہی سبب ہے کہ قدیم اردو ادب میں ڈراما کی شکل کی کوئی چیز نشوونما نہ پا سکی۔

انگریزی اثر کے تسلط کے بعد، انگریزی ناٹک، خاصکر "آپیرا" کے تتبع میں، لکھنؤ کے مشہور شاعر، امانت نے "اندر سبھا" کے نام سے جو ناٹک لکھا تھا۔ وہ اردو ادب میں غدر سے پہلے کی تنہا پیداوار ہے۔ میاں امانت کے زمانے میں، نواب واجد علی شاہ کی سرپرستی کی وجہ سے "اندر سبھا" کو لازوال شہرت نصیب ہو گئی، یہ چیز اس قدر مقبول ہوئی کہ اسکی تقلید میں مداری لال کی "اندر سبھا" اور ایک اور شاعر کی "مجھندر سبھا" غرض کئی سبھائیں پیدا ہو گئیں۔ لیکن ان میں سے کوئی کوشش بھی اردو ادب عالی میں جذب ہو کر، ایک نئے شعبہ ادب کو نشوونما نہ دے سکی۔ امانت کی "اندر سبھا" صرف ایک عجوبہ کے طور پر باقی رہ گئی۔

اردو ڈراما میں اگر کوئی چیز کسی اہمیت کی مالک ہے تو وہ مغربی اسٹیج کے اثر کی پیداوار ہے۔ اولین ڈرامے زیادہ تر انگریزی ڈراموں خصوصاً شکسپیر کے کھیلوں کے ترجمے ہیں۔ کچھ قدیم سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ان میں نہ تو انگریزی ڈراما کی پوری پیروی کی گئی ہے۔ اور نہ سنسکرت کے اصول قائم رکھے گئے ہیں بلکہ یہ دونوں طرز کے ڈراموں کی ایک ملی جلی اور مسخ شدہ صورت ہے۔ انگریزی ڈرامے یا تو نثر میں لکھے جاتے ہیں یا نظم معرا میں۔ سنسکرتی ڈرامے نظم اور نثر دونوں میں لکھے گئے ہیں۔ اولیں اردو ڈراما نگار نے انگریزی قصے لے لئے اور ان کے لئے اپنا مرغوب، مقفیٰ اور مسجع اسلوب استعمال کیا۔ "شکنتلا" ناٹک کی طرح ان ڈراموں میں بھی جا بجا اشعار بھرتی کر لئے گئے اور اس طرح مخلوط نوعیت کے ڈرامے تیار ہونے لگے۔ انگریزی میں قافیہ کو سد راہ مطلب سمجھکر، ترک کر دیا گیا تھا اور وزن قائم رکھا گیا تھا۔ اردو میں وزن چھوڑ دیا گیا اور قافیہ کی پابندی ضروری سمجھی گئی۔ اس مخصوص اسلوب میں اس قدر غلو سے کام لیا جانے لگا کہ، خیال اور تسلسل دونوں کی بیدردی سے قربانی ہونے لگی اور اردو ڈراما رفتہ رفتہ تک بندی اور قافیہ پیمائی کی ایک عجیب و غریب چیز بن کر رہ گیا۔ اشعار کی بھرمار ایسی ہوئی کہ خدا کی پناہ، اور عموماً اشعار یا تو بے موقع ٹھونس دیئے جاتے تھے یا پھر ان میں شعریت اور حسن بیان کا پرتو تک بھی نہیں ہوتا تھا۔ مذاق سلیم پر اس عجیب و غریب پیداوار کا جس قدر زبوں اثر بھی ہوتا ہو وہ کم ہے۔ بعض ناٹک ایسے بھی دیکھے گئے جو شروع سے آخر تک نظم میں لکھے گئے تھے۔ ڈراما کی یہ ایک خاص قسم ہے جو "آپیرا" کہلاتی ہے۔ اس میں

ڈراما سے زیادہ موسیقی کی دھنوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ لیکن اس اردو "آپیرا" میں شروع سے آخر تک ایک ہی بحر استعمال کی گئی تھی۔ ان میں سوائے ادنی درجے کی نظم کے کوئی اور خوبی ایسی نہیں ہوتی جو ڈراما کے اصول پر پوری اتر سکے۔ اردو کا صرف ایک کارنامہ "لیلی مجنوں" ہے، جس میں "آپیرا" کے اصول کی بڑی حد تک پیروی کی گئی ہے۔ لیکن اسکے مصنف مرزا ہادی رسوا نے ایک مزید جدت طرازی یہ کی ہے کہ، اردو کی تمام مروج بحروں کو اس میں کھپانیکی کوشش کی ہے۔ جسکی وجہ سے ان کا بہت سا وقت ضایع گیا۔ اور یہ کارنامہ "آپیرا" کے ساتھ ساتھ عروض کی کتاب بھی بن گیا ہے۔

یہ تو اولین اردو ڈراموں کی ادبی خوبیاں تھیں۔ اسٹیج جن کے ذریعہ یہ ڈرامے پیش کئے جاتے تھے وہ بھی اپنی ہیئت کذائی میں انوکھی اہمیت کے مالک ہیں۔

فلم سازی، خصوصاً گویا فلم کی موجودہ ترقی سے پہلے پہلے تک، ہندوستانی ڈراما اور ناٹک کے ٹھیکہ دار، عموماً پارسی تھے۔ جو اس کاروبار کو مے فروشی کے دھندے کی طرح نفع اور تجارت کی حیثیت سے کرتے تھے۔ منشی یعنے ڈرامانویس، ان کے پاس ملازم ہوتے اور ڈرامانگاری کے کام کو وہ فرض کی حیثیت سے انجام دیتے تھے یا ان کے لئے پیشہ بن گیا تھا۔ ان منشیوں کا الہام اردو اور ہندی کا قدیم افسانوی ادب تھا۔ ناٹک کمپنی کے مالک کو اسکی پروا نہیں تھی کہ کسی خاص ڈرامے سے عوام کے مذاق اور کردار پر کیا زبوں اثرات مرتب ہونگے اور ان کے دماغوں میں کس قسم کے خیالات کا نشو ونما ہوگا۔ اگر کسی حسین ایکٹرس کا منہ چومنے پر تماشہ گھر تالیوں سے گونج اٹھتا، تو یہ ڈراما اور ڈرامہ نگار دونوں کی بڑی کامیابی سمجھ لیتے۔ اداکاروں کی یہ حالت کے "ق" "ش" تک درست نہیں۔ پھر انکی گفتگو کے لہجے بھی مخصوص ہوتے تھے، جنھیں "ناٹکی لہجہ" کہنا چاہئے اس میں ضرورت سے قطع نظر جا و بے جا الفاظ پر بری طرح زور دیا جاتا تھا۔ اسطرح کے لہجے موجودہ گویا فلم میں بھی بعض دفعہ سنائی دیتے ہیں۔

شکسپیر کے ڈرامے، قدیم معاشرہ سے تعلق رکھتے ہیں اسلئے ان کے پیش کرنے میں اس زمانے کے لباس کا التزام کیا جانا ضروری ہوتا ہے اسکی کورانہ تقلید میں ہمارے اسٹیج پر، ہماری قدیم اور جدید معاشرہ کے لباس ہی بے تعلق عجیب ہیئت کے لباس پیش کئے جاتے ہیں۔ اداکاروں کے اظہار جذبات کے طریقے بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

ادنیٰ درجے کی قدیم اردو شاعری کی طرح ان قدیم ڈراموں کے عاشق و معشوق سے لیکر ایک تاجر تک اور شاہ سے لیکر گدا تک کے فجائیات مبالغہ آمیز اور بے ضرورت ہوتے ہیں۔ اظہار جذبات کے نفسیاتی رازوں سے یہ اداکاری محض نابلد ہوتی ہے۔

یہ ان "ضابطوں" کا سرسری بیان ہے، جو ہندوستانی ڈرامے یا ہندوستانی اسٹیج پر کل تک حکمران تھے، ظاہر ہے کہ اس طرح کے ڈرامے اب اپنا عہد ختم کر چکے۔ ہندوستانیوں کا اولین تحیر اور اشتیاق اور اسٹیج کی پہلی ندرت گذر چکی۔ اب طبیعتیں زیادہ حیات نما چیز چاہتی ہیں۔ ذوق حیات حقیقی کے ڈرامے کا طلب گار ہے۔ ایسی فضا میں، قدیم صورت سے ذوق تماشہ کو کیسے تسلی ہوسکتی ہے۔

فطرت کے کارکن ہمیشہ برسرکار ہیں۔ حقیقی ڈراما کی تلاش نے تربیت یافتہ طبقوں کو دوسرے زاویئے تلاش کرنے پر مجبور کردیا۔ لیکن ہمارے اپنے ہاں حقیقی ڈراما کی شکل کی کوئی چیز نشوونما پانے سے پہلے پہلے مغرب میں ناٹک کا رواج کم ہوگیا۔ اور اس کی جگہ "فلم" نے لے لی۔ اسی لئے اکثر تماشا دوست، انگریزی "فلم" کی طرف متوجہ ہوگئے اب ہندوستان کو بھی اس کاروبار میں قدم رکھنا ناگزیر ہوگیا۔ قاعدہ ہے کہ کسی فن میں خوبی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچنے کے لئے پہلے اس میں جذب ہو جانا اور اسکا جزبدن ہوجانا ضروری ہے اردو میں ڈراما کی پیدائش کا وقت آنے کو تھا کہ انگریزی فلم نے ذہنوں کو مصروف کرلیا۔ فلم کے لئے جو ڈرامے لکھے جاتے ہیں، انکی خصوصیات، ناٹک سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس لئے اب مغربی ڈراموں کی نوعیت کے کارنامے اردو میں پیدا ہونے کے موقعے بہت کم ہوگئے ہیں۔

لیکن ڈراما کا وجود، اسٹیج تک ہی محدود نہیں ہے۔ اسکی ایک ادبی اہمیت اور ایک اخلاقی، جمالی اور تعلیمی دلچسپی بھی ہے۔ جس طرح ڈراما کے دیکھنے سے اہل تماشا تسلی پاتے ہیں۔ اہل نظر کو بھی ان کے پڑھنے سے حظ حاصل ہوتا ہے۔ اکثر صورتوں میں فرد اور قوم کے معتقدات کو متاثر کرنے کا یہ بہترین ذریعہ ثابت ہوا ہے تحریری شکل میں یہ ادبیات کا اعلیٰ ترین شعبہ ہے۔ ڈراما کی یہ اہمیت وقت اور مذاق کی قیود سے علیٰ و ارفع ہے اس حقیقت کو محسوس کرکے ملک کے بعض اداروں اور افراد نے ہندوستانی حیات معاشرت، ر

معتقدات، روایات، اور ضروریات کے ڈرامے تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ جامعہ ملیہ نے ابتک کئی قابل قدر مختصر ڈرامے شائع کئے۔ جن میں "ہمزاد" "صید زبوں" "کھیتی" "معلم اسود" "نقش آخر" قابل ذکر ہیں۔ لاہور میں بھی اسی طرح کی مساعی برابر جاری ہیں جن میں سے "انار کلی" .... وغیرہ منظر عام پر آچکی ہے۔

پنجاب اور جامعہ ملیہ کی سعی کے آغاز سے کچھ عرصہ قبل، حیدرآباد میں، نوجوان تعلیم یافتہ حضرات کی ایک سوسائٹی قائم ہوئی تھی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ جاہل اور کم سواد ناٹک کمپنیوں کی چیرہ دستیوں سے اردو اسٹیج کو خلاصی دلائی جائے۔ چنانچہ اپنے مقصد کی پیش رفت میں اس نے چند مشہور کھیل شائستہ لب ولہجے میں پیش کئے۔ اس سوسائٹی کی توجہ تمامتر اسٹیج کی اصلاح تک محدود رہی۔ ڈراما کی ادبی اصلاح سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسکے علاوہ اس کو اپنے مقاصد میں کچھ خاطرخواہ کامیابی بھی نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس زمانے میں شرفا اپنی اولاد کو اس طرح کے لہو لعب سے حتی الامکان بچاتے تھے۔

پچھلے چند سال میں حالات بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ اور تین چار سال سے یہ مساعی زیادہ منظم اور بلند پایہ ہوگئی ہیں۔ ہندوستانی اسٹیج سے تربیت یافتہ دماغوں کی بداعتقادی دور کرنے میں سب سے پہلا جرأتی قدم کلیہ جامعہ عثمانیہ کی انجمن اتحاد نے اٹھایا۔ پہلا ہی ڈراما "کالج کے دن" جو کلیہ ہی کے ایک طالب علم کا لکھا ہوا تھا۔ باوجود کم سامانی کے ایسے شائستہ انداز میں پیش کیا گیا کہ آنکھیں کھل گئیں اور سعی کے لئے ایک نیا باب کھل گیا۔ دوسرے سال انجمن اتحاد نے مشہور المانی ادیب گوئٹے کے شہ کار "فاوسٹ" کو پیش کیا۔ اور اسی سال پھر کالج ہی کے دو طالب علموں کا ایک ڈراما "ہوش کے ناخن" دکھایا گیا۔ اب یہ کیفیت ہوگئی ہے کہ ڈراما علمی اداروں کے جلسوں کا ایک لازمی جزبن گیا ہے۔ چنانچہ نظام کالج، انٹرمیڈیٹ کالج ورنگل اور دوسرے اکثر مدارس کے طلبا، آئے دن بہتر سے بہتر ڈرامے پیش کر رہے ہیں۔ ممالک محروسہ اور خصوصاً دارالسلطنت کے طول وعرض میں ڈرامہ نگاری پیش کشی کا جو صحیح تر ذوق ابھر رہا ہے اسکا یہ ظاہر ثبوت ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے بعض فارغ التحصیل اور دوسرے تعلیم یافتہ حضرات، جنہیں اس فن سے لگاؤ ہے۔ ڈراما نگاری اور اسٹیج کی ترقی میں ہمہ تن سرگرم عمل ہیں۔

"انجمن ترقی ڈراما" نے اس خصوص میں سب سے زیادہ نمایاں کام انجام دیا ہے۔ اب تک دو ڈرامے "نئی روشنی" اور "ظاہر و باطن" اس نے مرتب کر کے پیش کئے اور دو اور ڈرامے "غلط در غلط" اور "حشرات الارض" تیار ہو رہے ہیں۔ ہر ڈراما کئی دفعہ دکھلایا گیا۔ پھر بھی لوگوں کو تسلی نہیں ہوئی۔ اضلاع اور بیرون ملک سے دعوت نامے آرہے ہیں لیکن انجمن کے کارکن ابھی دارالسلطنت سے باہر نکلنا نہیں چاہتے۔

دوسری جماعت "دی حیدرآباد ڈرامیٹک الیسوسی ایشن" کی ہے۔ جو ریاست کے علم دوست وزیر نواب سر امین جنگ بہادر کی سرپرستی میں، یہ کام انجام دے رہی ہے۔ اس نے بھی مشہور اردو ڈراموں میں سے دو تین "صید زبوں" "پردۂ غفلت" اسٹیج پر پیش کئے جو بہت مقبول ہوئے۔

مذکورۂ بالا جماعتوں کے علاوہ دو اور انجمنیں "بزم اداکاری" اور "بزم تمثیل" بھی سرگرم کار ہیں آخرالذکر بزم کے متعلق یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ شہر کے قیام حیدرآباد کے زمانے میں قائم ہوئی تھی اب پھر اسکا احیا کیا گیا ہے۔ حیدرآباد کے امرا میں وزیر اعظم دولت آصفیہ مہاراجہ یمین السلطنۃ سر کشن پرشاد بہادر کو شعر و سخن کی طرح اسٹیج اور ڈراما کی ترقی سے بھی خاص دلچسپی ہے۔ آپ نہ صرف انعام او اعزاز کے ذریعہ اداکاروں اور ڈراما نگاروں کی ہمت افزائی کرتے رہتے ہیں بلکہ خود آپکے ایک مشہور ادبی کارنامے کا کچھ دن قبل بولتا فلم تیار کیا گیا تھا جو حیدرآباد اور باہر کے اسٹیج پر کئی دفعہ دکھلایا گیا اور مقبول ہوا۔

نواب سالار جنگ بہادر اور نواب لطف الدولہ بہادر، امیر کبیر پائیگاہ کو بھی اس فن کی ترقی سے دلچسپی ہے یہ فضا اور یہ قدردانیاں، حیدرآباد میں ہندوستانی اسٹیج اور اردو ڈراما کی ترقی کے متعلق ہمت افزا مستقبل کی خوش خبری دے رہی ہیں۔

آخر میں ایک امر قابل ذکر رہ جاتا ہے۔ ان کامیاب ڈراموں میں سے طبع ہو کر منظر عام پر شاید ہی کوئی ڈراما آیا ہوگا۔ اس ضرورت کی اہمیت سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ سلسلہ ادبیات اردو کی طرف سے "ہوش کے ناخن" کی اشاعت عنقریب ہو رہی ہے امید ہے کہ چند روز میں دوسری مساعی بھی منظر عام پر آجائیں گی۔

عہد حاضر کے تعلیمی رجحانات

از

ابو المکارم مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے۔ ڈپ ایڈ

تاریخ تعلیم پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ملک اور ہر زمانہ کچھ نہ کچھ تعلیمی خیالات کا حامل رہا تھا جو اس کے رسم و رواج، اس کی ضروریات اور اس کے مروجہ فلسفہ سے مطابق ہوتے تھے جیسے جیسے تمدن ترقی کرتا گیا تعلیمی خیالات اور طریقے بھی اسی نسبت سے بدلتے گئے اور ہر تعلیمی فلسفہ اپنے ما قبل فلسفہ سے کسی نہ کسی طرح سے متاثر رہا۔ عہد حاضر کے تعلیمی رجحانات پر غور کرنے سے پہلے ان تین تعلیمی تحریکات کا ذکر نامناسب نہ ہوگا جو اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران میں کارفرما رہی ہیں۔

پہلی تحریک نفسیاتی تحریک ہے جس کا تعلق طریقہ تعلیم سے ہے، دوسری سائنٹفک تحریک ہے جس کا تعلق مواد مضمون سے ہے اور تیسری تحریک سماجی تحریک ہے جسکی ابتدا انسویں صدی کے اواخر سے ہوئی اور جو موجودہ زمانہ کی تعلیم کی روح رواں ہے۔ ان تین تحریکات کے اساسی خیالات کو چند جملوں میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔ روسو نے بتلایا کہ تعلیم خود زندگی ہے جس کا مرکز بچہ ہے۔ پسٹا لوزی نے اس خیال کی تبلیغ کی کہ تعلیمی امور کا انحصار بچہ کے متعلق حقیقی معلومات حاصل کرنے اور اس کے ساتھ ہمدردی کرنے پر ہے۔ تعلیم

داخلی ہونی چاہئے نہ کہ خارجی، تدریس اعمال کی اساس اشیاء ہیں نہ کہ علامات، ابتدائی تربیت کی اساس اعمال حافظہ نہیں بلکہ حسی ادراک ہے، ہربارٹ نے سائنٹیفک طریقہ تعلیم کی بناڈالی، تربیت کردار کو تدریس کا مقصد ٹھہرایا اور یہ بتلایا کہ یہ مقصد سائنٹیفک طریقہ تعلیم اور نصاب کی سائنٹیفک تنظیم سے حاصل ہوسکتا ہے فروبل نے بچے کی فطرت پر زور دیا، تعلیم میں بچہ کی خود سعی تخلیقیت پر توجہ دی اور تعلیمی مسائل کو اصول ارتقاء سے منسلک کرنے کی کوشش کی۔ یہ نفسیاتی اور سائنٹیفک تحریک کی جدوجہد ہے۔ سماجی تحریک نے اس امر پر زور دیا کہ تعلیم سماجی نشو ونما کا ذریعہ ہے، اس کا مقصد اچھے شہری پیدا کرنا ہے جو اس وقت پورا ہوسکتا ہے جبکہ افراد میں شخصیت کی نشو ونما ہو۔ مختصر یہ کہ اس تحریک کا مقصد ایسے انسان پیدا کرنا ہے، جو خود اپنی مدد آپ کرکے سماج کی مدد کرسکیں۔

آج کل کی متعدد تحریکات میں سب سے اہم چیز نصاب تعلیم میں "پیشہ کی تعلیم" کا اضافہ ہے۔ برطانیہ عظمیٰ، جرمنی اور امریکہ کی باہمی رقابت پیشہ ورانہ اور صنعتی تعلیم کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی اور تقریباً تمام متمدن ممالک نے یہ محسوس کیا کہ جب تک صنعتی تعلیم کی طرف توجہ نہ کی جائے۔ صنعتی مقابلہ میں سر اٹھانا محال ہے اس خصوص میں جرمنی اور امریکہ نے خاص کوشش کی۔ جرمنی نے اس قسم کی تعلیم کا انتظام تسلسلی مدرسوں (Continuation Schools) میں کیا اور بالخصوص جنگ مابین فرانس وجرمنی (Franco-Prusstan War) کے بعد سے صنعتی تعلیم نے بہت زور پکڑا اور فرانس اور بالخصوص جرمنی میں اعلیٰ صنعتی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا۔ امریکہ نے بھی اس سلسلہ میں بہت کچھ کیا۔ اور وہاں اعلیٰ صنعتی مدارس کے علاوہ زرعی کالج بھی قائم ہوگئے۔

اس سلسلہ کا دوسرا رخ قومی صحت کی حفاظت ہے، جنگ عظمیٰ کے بعد سے یہ چیز محسوس کی گئی کہ تنازع للبقاء کا مسئلہ تشنہ رہ جائے گا اگر صرف صنعتی مقابلہ کے لئے قوم کو تیار کیا جائے اور قومی صحت کو نظرانداز کردیا جائے۔ اس مقصد کو بھی مدرسہ ہی سے متعلق کیا گیا کہ مدرسہ ہی وہ مقام ہے جہاں صحیح معنی میں قومی صحت کے مسئلہ پر کامیابی سے توجہ دی جاسکتی ہے۔ یہ تحریک ابھی ابتدائی منزلوں سے گذر رہی ہے، برطانیہ اور

امریکہ نے تو اس میں بہت کچھ ترقی کر لی اور بہت ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں ان کا اثر تمام متمدن ممالک پر پڑے۔

عہد حاضر کی تیسری نمایاں چیز یہ ہے کہ زندگی کے جمہوری نقطۂ نظر کو بھی تعلیم ہی سے متعلق کیا گیا ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جمہوریت کو صرف ایک سیاسی خیال تصور کیا جاتا تھا لیکن صنعتی انقلاب نے جمہوری نصب العین میں وسعت دی اور یہ مناسب خیال کیا گیا کہ افراد میں جمہوری اسپرٹ پیدا کی جائے اور یہ اسپرٹ اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ مدرسہ کی تعلیم جمہوری رنگ میں نہ رنگی جائے۔ چنانچہ ایک انگریز مدبر نے کہا ہے کہ "اب ہمیں آقا پیدا کرنے چاہئیں" عہد حاضر کے تمام تعلیمی طریقوں میں یہی روح کارفرما نظر آتی ہے یہ کوئی بالکلیہ نئی چیز نہیں ہے بلکہ پستالوزی، ہربارٹ اور فروبل کے خیالات کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

صنعتی تعلیم کے بعد دوسری چیز جو بعض ماہران تعلیم اور انسان دوست دماغوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی وہ معذوروں کی تعلیم ہے۔ معذور سے نہ صرف جسمانی معذور مراد ہے بلکہ ذہنی اور اخلاقی بھی۔

یہ گروہ بھی سماج کا ایک ناقابل فراموش فرد ہے اسی باعث وہ سماجی تحریک کے فیض سے بے نیاز نہ رہ سکا اور اب اس گروہ کی تعلیم کا بھی خاطر خواہ انتظام ہو چکا ہے۔

ایڈورڈ سیگوئین Edward Seguin نے سنہ ۱۸۵۰ء میں پہلی دفعہ ذہنی معذوروں کو باضابطہ تعلیم دینے کا بیڑا اٹھایا اور بتلایا کہ ضعیف العقلی اور پس افتادگی Backwardness گو ایک حد تک موروثی ہیں تاہم حسی اعصاب سے مدد لیکر دماغی صلاحیت میں ترقی دی جا سکتی ہے۔ ابے چارلس مائیکل دیل ایپے A. C. Michel del Epee نے بہروں کو تعلیم دینے کا "خاموش" طریقہ نکالا اور دوسرا فرانسیسی ماہر تعلیم ابے والن ٹن ہائے AbbeValentin Hauy نے ابھرے ہوئے حروف کے ذریعہ اندھوں کو تعلیم دینے کا کامیاب طریقہ ایجاد لیا۔ اب اس طریقہ نے بہت کچھ ترقی کر لی ہے اور اندھوں کو نہ صرف ابتدائی تعلیم ہی دی جاتی ہے بلکہ اعلیٰ تعلیم کے وسائل بھی بہم پہونچائے گئے ہیں۔ اس انسان دوستانہ اسپرٹ پر عہد حاضر جس قدر فخر کرے کم ہے!

عہد حاضر کا دوسرا شاندار اور درخشاں کارنامہ طریقۂ تعلیم اور فلسفۂ تعلیم کی انقلاب انگیز تبدیلی ہے،

اس خصوص میں اطالوی خاتون ڈاکٹر میریا مانٹی سوری اور امریکی فلسفی جان ڈیوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ مانٹی سوری نے بچوں کو تعلیم دینے کا جو طریقہ بتلایا ہے وہ بالکلیہ اس کے دماغ کی تخلیق نہیں بلکہ ہربارٹ کے فلسفہ اور فروبل کے بالک گھر Kinder Garten کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے، اس کے طریقۂ تعلیم میں بچہ کی انفرادی آزادی، خود ضبطی اور خود سعی پر خاصہ زور دیا گیا ہے جو ہر لحاظ سے اس جمہوری دور کے مناسب حال ہے، اسی باعث اس کے طریقۂ تعلیم کو آج تمام دنیا قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

جان ڈیوی کے طریقۂ تعلیم اور اس کے تعلیمی فلسفہ کی نوعیت بالکل نرالی ہے وہ قدیم فلسفہ سے یک لخت انحراف کرتا ہے۔ قدیم فلسفہ یہ کہتا ہے کہ نفس تمام زندگی تک یکساں اور غیر متبدل رہتا ہے اور بچہ اور بالغ دونوں میں اس کے مختلف شعبے ہوتے ہیں مثلاً حافظہ، تفکر، انصاف، وغیرہ۔ یہ شعبے یکے بعد دیگرے رونما ہوتے اور کام کرنے لگتے ہیں۔ بچہ اور بالغ میں فرق صرف دن کی مقدار کا ہوتا ہے گو اس خیال کے مدنظر بچہ ایک "چھوٹا آدمی ہے"۔ ڈیوی کے نزدیک یہ نقطۂ نظر بالکل غلط ہے، وہ کہتا ہے نفس ایک مستقل و مطلق چیز نہیں بلکہ اصول ارتقاء کے مطابق وہ نمو پذیر ہے۔ اس جدید فلسفہ کی بناء پر اس امر کی ضرورت لاحق ہوی کہ طریقہ ہائے تعلیم کو بدلکر بچہ کی عمر کے مدارج کے لحاظ سے انکی تنظیم کی جائے۔

ڈیوی کا دوسرا شاندار کارنامہ مواد تدریسی سے متعلق ہے۔ اس معاملہ میں وہ تولیدی نفسیات Genetic Psychology سے مدد لیتا ہے اور کہتا ہے کہ نفس ایک سماجی چیز ہے، وہ سماج کے تابع ہے اسی لئے اسکو ترقی دینے کیلئے نصاب تعلیمی کو سماجی حالات کے تحت ڈھالنا چاہئے اس سے بچہ اور نصاب میں ایک قسم کا حقیقی رشتہ پیدا ہو سکتا ہے۔

ڈیوی نے ان خیالات کو محض نظریہ کی حد تک نہیں رکھا بلکہ ایک سائنس داں کی اسپرٹ میں وہ معمل (مدرسہ) میں کھڑا ہو کر آلات (بچوں) سے تجربے کرتا اور سود مند اور قابل عمل نتائج اخذ کرتا ہے، اس کے لئے اس نے اپنے مشہور تجرباتی مدرسہ Experimental School کی ابتدا کی اور اپنے منصوبی طریقہ Project Method کو جاری کیا جس کو آج عالمگیر شہرت حاصل ہوگئی ہے۔

اسی باعث ڈیوی کو زمانۂ حال کا ممتاز ترین ماہر تعلیم مانا جاتا ہے۔

عہد حاضر کی ایک اور مہتم بالشان تحریک یہ ہے کہ اب تعلیم میں بھی اسیطرح کے ریاضیاتی انداز سے کام لیا جارہا ہے جس کے مالک کبھی طبعی حیاتیاتی علوم تھے۔ اب تک تعلیمی امور کا انحصار زیادہ تر شخصی قیاس و تجربہ پر تھا جو بہت ہی غیر حکمی طریقہ کار ہے اور جس کے باعث تعلیمی نتائج اکثر و بیشتر غیر صحیح اور غیر تشفی بخش رہا کئے لیکن عہد حاضر کی سائینٹفک اسپرٹ نے تعلیم پر بھی گہرا اثر ڈالا اور بعض نکتہ رس ماہران تعلیم جن میں سرفرانسیس گالٹن اور کارل پیرسن کے نام قابل ذکر ہیں اس طرف توجہ دی اور انہوں نے ایسے شماریاتی طریقے Statistical Methods اور ضابطے ایجاد کئے کہ جن سے تعلیمی حصول Educational Achievement کی پیمائش ممکن ہوگئی۔ یہ طریقے اور ضابطے نہ صرف سادہ یا ادنیٰ تعلیمی امور مثلاً مدرسہ کی محصلہ قابلیت کی جانچ کے لئے بھی مفید ہیں بلکہ ان کے ذریعہ اصناف کے ذہنی تفرقات Mental Differences of Sexes انفرادی تفرقات، انتقال قوی ذہنی Transfer of Mental Power کا امکان وغیرہ جیسے اہم مسائل بھی بہت ہی صحت کے ساتھ حل کئے جاسکتے ہیں۔ یہ ضوابط قیاسی نہیں بلکہ اُن تجربات کے نتائج ہیں جو تعلیمی ماہران نفسیات نے نفسیاتی معملوں میں بہت ہی دماغ سوزی سے انجام دیا ہے۔ امریکہ میں تھارن ڈائیک، فرانس میں بی نے، جرمنی میں مائی مان اور ڈبلیو اے۔ لے، انگلستان میں ڈبلیو ایچ وینچ اور سیرل برٹ نے اس جدید موضوع پر بہت کچھ کام کیا ہے جو مستقبل کے محققین کے لئے بہت ہی عمدہ راہ عمل ثابت ہوگا۔ یہ موضوع اب اپنی تنوع اور اہمیت کے باعث ایک علیحدہ مضمون بن گیا ہے جسکو تعلیمی تجرباتی نفسیات Educational Experimental Psychology کہتے ہیں۔

اس خصوص میں کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر تھارن ڈائیک کا کارنامہ بہت ہی شاندار ہے اس نے اپنی کتاب تعلیمی نفسیات Educational Psychology میں اپنے کام کی نوعیت اور نتائج کو بہت ہی اچھی طرح سے واضح کیا ہے اس میں اس نے بتلایا ہے کہ آزمائشی پیمانے جو اختیاری اور

موضوعی ہوں درست نہیں بلکہ معروضی اور غیر شخصی ہونے چاہئیں۔ اگرچہ کہ اس طریقۂ کار سے بعض تعلیمی مسائل مثلاً اختلاف قابلیت اور تدریس کے اثرات وغیرہ کا حل بادی النظر میں مشکل نظر آتا ہے تاہم موجودہ رفتار سے انکے حل کی توقع کیجاسکتی ہے۔ اب تک بہت سے پیمانے تیار ہوچکے ہیں جن میں تھارن ڈائیک، آئیر، فری من، سٹون، کرٹز، تھارن ڈائیک Hand writing Schales اور ولسن کے خطاطی کے پیمانے اور آئیر کے حسابی قابلیت کے پیمانے، ہلی جس اور تھارن ڈائیک کے انگریزی مضمون نگاری کے پیمانے، والن، پیرسن، وہپل اور سوزانو کے ہجا کے پیمانے اور مائی مان، لوبا اور ہائیڈ کے ڈرائنگ کے پیمانے، بہت مشہور ہیں اور تعلیمی دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جارہے ہیں۔ انکے علاوہ الفرڈ بی نے Binet فرانس کے وزیر تعلیمات کی ایما سے جو ذہانتی پیمائشات Mental Tests تیار کئے ہیں وہ اپنی جدت اور اہمیت کے باعث اس قدر مقبول ہوچکے ہیں کہ اس وقت دنیا کا ہر متمدن ملک ان کو اپنے ملکی حالات کے لحاظ سے اپنا کر استعمال کر رہا ہے۔ بی نے کی تیار کردہ پیمائشات انفرادی آزمائش کے لئے ہیں لیکن بعض ماہران تعلیم نے جماعتی آزمائش کے لئے بھی پیمانے تیار کئے ہیں جن میں امریکی پروفیسر ٹرمن Terman کا پیمانہ بہت اہم اور عمدہ ہے۔ انکے علاوہ پیشہ کے انتخاب اور کردار کی جانچ کیلئے پیمانے بھی تیار کئے گئے ہیں جنکا استعمال مغربی ممالک میں بہت مفید ثابت ہوا ہے۔

بہرحال مغربی ماہران تعلیم کی ان ان تھک کوششوں نے تعلیمی طریقوں کو ایک سائنٹیفک چیز بنادیا ہے جو ہر طرح سے سماجی فلاح وبہبود اور قومی ترقی کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہیں۔ اس مختصر سے مضمون کو ختم کرنے سے قبل میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ چند سطریں ہندوستانی تعلیمی ہلچل کے بھی نذر کروں۔ ہندوستان تعلیمی اعتبار سے مغربی ممالک سے بہت پیچھے ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ صدیوں پیچھے ہے۔ یہاں کی تعلیم پر ابھی قدامت کا رنگ غالب ہے اور ابتدائی تعلیم ابھی تک اسی پرانے ڈگر پر ہی دی جاتی ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر ہمارے قاعدوں Primers پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں اور آج سے تین صدی قبل کامی نیس Comenius کے زمانے میں جو "قاعدے" تھے۔ انہیں بہت کم فرق نظر آئے گا۔

بچوں کی تعلیم کو مغرب نے ایک آرٹ (فن) بنا دیا ہے مگر ہندوستان میں اس طرف کچھ بھی توجہ نہیں کی گئی۔ صنعتی تعلیم پر نظر ڈالئے تو اس سلسلہ میں بھی کچھ کام نظر نہ آئے گا اور شاید ایک آدھ کالج اور چند مدرسے تبرکاً مل جائیں تو مل جائیں۔ ذہنی معذوروں کا سوال تو کبھی اٹھایا ہی نہیں گیا اور عضویاتی معذوروں کو تو تعلیم سے بے نیاز ہی تصور کیا جاتا ہے جن سے مسئلہ بیکاری ترقی کرتا جا رہا ہے اور گداگری کو فروغ ہو رہا ہے جو ہر طرح قومی ادبار کی علامت ہے۔ بڑی مشکل تو یہ ہے کہ ہم ہندوستانی جب باتیں کرنے پر اتر آتے ہیں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں لیکن جب عملی کام کا وقت آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ پاؤں میں دم نہیں۔ ہمارا ملک جو دوسری قوموں کے مقابلے میں اگر بالکلیہ مردہ نہیں تو کم از کم نزع کی حالت میں ضرور ہے اور اگر وہ مغرب سے جلد تریاق حاصل نہ کرے تو کیا تعجب ہے کہ اس کی نیم وا آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں۔

گذشتہ دس پانچ سال کے عرصہ میں پنجاب، میسور، اور بنگال کے بعض علاقوں میں تجرباتی نفسیات سے متعلق تھوڑا بہت کام ہوا ہے، گذشتہ سال سے حیدرآباد میں بھی مولوی سید اکبر علی صاحب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ کی زیر قیادت تجرباتی نفسیات سے متعلق عملی کام شروع ہوا ہے۔ اگر اس طرح کی دلچسپی باقی رہی تو ممکن ہے کہ کام چل نکلے۔ ہمیں ضرورت ہے کہ صنعتی تعلیم، معذوروں کی تعلیم اور ابتدائی تعلیم کے مسائل کو حل کر کے قومی پستی کو دور کرنے کا کوئی مناسب نسخہ تجویز کریں۔ مغربی ماہران تعلیم کے کارنامے اور انکے نتائج ہماری بہت کچھ رہبری کر سکتے ہیں۔

آخر میں، میں اس مہتم بالشان ہندوستانی تعلیمی تحریک کا ذکر کرنا اہم سمجھتا ہوں جو عرصہ تک مغربی اور مشرقی ممالک کے ماہران تعلیم کی الجھن کا باعث رہی اور اب جس کی اہمیت ہر طرح سے عملی اور فطری دونوں نقاط نظر سے مسلم ہو چکی ہے، یہ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ کی "مادری زبان میں تعلیم" دینے کی تحریک ہے جس کا عملی نمونہ جامعہ عثمانیہ اور اسکی کامیابی ہے۔ اب ہندوستان کے اکثر علاقوں نے اسکی اہمیت اور شدید ضرورت کو محسوس کر کے مادری زبان میں تعلیم دینے کا پایہ ڈال دیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ مفید اور اہم تحریک بہت جلد عالمگیر مقبولیت حاصل کرلے یہی ایک اور صرف ایک تحریک ایسی ہے جس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان تعلیم سے بالکلیہ بے خبر نہیں ہے بلکہ ایک لحاظ سے زندہ ہے۔

طرح آشنائی

از

محمد عبدالوحید صاحب صدیقی - قدسی

نگفتم با کسے در دہر طرح آشنائی ہا ❊ کہ مشہور است در عالم بہ کافر ماجرائی ہا

شہے دارم کہ با اقبال حسنِ خود نمائے خود ❊ بدار الملک خوباں می کند فرماں روائی ہا

بوصلِ گل رخاں ہم عاشقاں راہست آرامی ❊ نفس در دل طپد از محنت درد جدائی ہا

صفائے غبغب آں ترک سیم اندام را میرم ❊ کہ بیروں می جہد از کف زبس دارد صفائی ہا

بفضل ایزدی ما را بہ گلزار سخن قدسی

رسید از بلبل شیراز ایں رنگیں نوائی ہا



میدان جنگ سے ایک خط

از

محمد سرفراز علی صاحب نیوش

ابا! ابا!! چلو کھیت سے چلو بھیا کا خط آیا ہے۔

اماں! اماں!! ادھر جلدی آ دیکھ بھیا کا خط آیا ہے۔

خزاں کا موسم گذر چکا تھا۔ ہر طرف درخت ہرے بھرے نظر آ رہے تھے۔ مہوے کا درخت گوندنی کی طرح لدا ہوا تھا اور اسکے پھول اپنی بھینی بھینی مست خوشبو سے جنگل کو معطر کئے دیرہے تھے یہی وہ زمانہ ہوتا ہے جبکہ گولر کے درخت پر دن بھر سینکڑوں چڑیاں جمع رہتی ہیں۔ کالے کالے بھنورے دن بھر جامن کے درخت پر بھنبھناتے رہتے ہیں۔ صرف یہی نہیں ہوتا ہے بلکہ آسمان کتنا صاف اور خوشنما دکھلائی دیتا ہے پھر یکایک ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگتی ہے کانتا نے کہا کسُم میرا بھیا کالی کالی بدلی دیکھکر ——

"روم جھوم بدلوا برسے"

کس مزے سے گاتا تھا۔ شاردا نے کہا اور میرے لئے انگوچھے میں جامن بھی لاتا تھا۔ ننھا وسنت خوشی سے چلا اٹھا

اور میرے لئے بھنورے۔

شاردا نے زور سے پکارا۔ ابا! ابا!! ابا!!! ادھر آؤ لو یہ خط ڈاکیہ دے گیا ہے۔ ابا میرے اچھے ابا۔ جلدی بتلاؤ اپنا بھیا کب آئے گا۔

شانتا چولہے کے پاس بیٹھی ترکاری بنا رہی تھی۔ جب اسکے کان میں بیٹے کے خط کی آواز گئی تو وہ ویسے ہی ننگے پیر دوڑی۔ اسکے پیر جلدی میں پانی بھرنے کی رسی میں الجھ گئے اور وہ گھبرا کر گر پڑی۔

شانتا دانتوں سے خون پونچھتے ہوئے اٹھی اور اپنے پریم پتی ارجن کمار سے خط پڑھانے لگی۔

باپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ شانتا جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھ رہی تھی کہ بتلاؤ بھیم خیریت ہے نہ بچے سب اردگرد جمع تھے اور سب بڈھے باپ کے بول پر منہ تک رہے تھے۔

بڈھے پریم نے کہا شانتا یہ خط اپنے بھیا کے ہاتھ کا نہیں ہے۔ یہ خط میدان جنگ سے آیا ہے۔ اپنا بھیم میدان جنگ میں زخمی ہو کر ہسپتال پہونچا دیا گیا ہے اسکے سینہ میں گولی لگی ہے۔ سریندر اسکا ساتھی لکھ رہا ہے کہ وہ جلد اچھا ہوئیگا

ماں غش کھا کر نیچے گر پڑی۔ جب اسکو ہوش آیا ہے تو اسکے اردگرد سب بچے جمع تھے۔ بڑی بچی کہہ رہی تھی اماں وہ ہسپتال سے جلد اچھے ہو کر آ جائینگے۔ ماں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اسکا دل دھڑک رہا تھا۔ پریم سرہانے بیٹھا آنسو پونچھ رہا تھا۔ نحیف اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں ماں نے کہا نہیں کانتا اب بھیا واپس نہ آئیگا۔

نوجوان بھیم اچھا نہ ہوا۔ بڈھا باپ جب خط پڑھ رہا تھا تب ہی اسکا دم نکل چکا تھا۔ ماں کی ہزاروں تمنائیں اسکے دم سے وابستہ تھیں بڈھا باپ اس کے کنگنا باندھنے کی آرزو میں تھا۔ بہنیں اپنے بھائی کے دیکھنے کیلئے بیتاب تھیں لیکن وہ اس دنیا سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو چکا تھا اور سب کی حسرت و تمناؤں کو اپنے ساتھ مٹی میں ملا چکا تھا۔

بوڑھی ماں کا کھانا پینا چھوٹ چکا تھا۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر رو دیا کرتی تھی اسکی حالت دن بدن ردی ہوتی گئی۔ ایک دن صبح بسنت ماں کو ہلا ہلا کر اٹھا رہا تھا وہ خاموش پڑی تھی۔ بچیاں اماں اماں کہکر پکار رہی تھیں مگر وہاں کچھ جواب نہ تھا۔

حیات و میکانیت

از

پروفیسر میر ولی الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹر ایٹ لا

حیات کیا ہے؟ ہم زندہ ہیں کیا ہم بتا سکتے ہیں کہ زندگی اپنی اصل و ماہیت کے لحاظ سے کیا ہے؟ ہم یہ تو بتا سکتے ہیں کہ زندگی کا کیا عمل ہے۔ ایک زندہ عضویہ پر نظر کرو اور دیکھو کہ وہ کیا کرتا ہے اس کی چند بے مثل خصوصیات تمہیں نظر آئینگی۔ ہم اس وقت انہیں چند بے مثل خصوصیات کے مجموعہ کو حیات کہہ سکتے ہیں۔ ادنیٰ سے ادنیٰ عضویت میں "تاثر پذیری" کی قابلیت پائی جاتی ہے یعنی یہ خارجی تہیجات سے متاثر ہوتی ہے اور ان کے جواب میں اس سے ایک خاص قسم کا عمل سرزد ہوتا ہے، ہیجانی طور پر یہ بعض تہیجات کیطرف بڑھتی ہے اور بعض سے کنارہ کش ہوتی ہے اسکو عمل اضطراری بھی کہا جا سکتا ہے، اور جبلتیں بھی ان ہی اضطراری اعمال کا نام ہے جو اور زیادہ پیچیدہ یا مرکب ہوتی ہیں۔ زندہ عضویت اپنی اصلاح آپ کرتی ہے، یہ اپنی مرمت یا تعمیر آپ کرتی ہے، مثلاً اگر کیکڑے کا پاؤں کٹ جائے تو وہ دوسرا پاؤں اسکی جگہ پیدا کر لیتا ہے۔ زندہ عضویت میں تطابق ذات کی قوت پائی جاتی ہے جسکی وجہ سے وہ اپنے کو ماحول کے مطابق بناتی ہے اور نیز اس میں تولید مثل نوعی کی قوت ہوتی ہے جو بقائے نوع کی ذمہ دار ہے اعلیٰ عضویتیں علاوہ ان خصوصیات کے حافظہ اور انتخاب کی قوت سے متصف

ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان میں عقل اور ارادہ بھی ہوتا ہے۔ کم از کم انسان کی ایک ایسی زندہ عضویت ہے جو خارجی یا باطنی تہیجات پر میکانکی طور پر ردِ عمل نہیں کرتی بلکہ حافظہ اور عقل کی مدد سے ان کا جواب دیتی ہے بالفاظ مختصر ایک اعلیٰ ترقی یافتہ زندہ عضویت کے خصوصیات اس طرح ادا کئے جا سکتے ہیں کہ وہ ایک ایسی وحدت ہے جو ماحول سے اپنا تطابق قائم کرتی ہے، جو اپنی ذات کو تکمیل دیتی، حفاظت کرتی، تعمیر کرتی اور اپنے مانند دوسری عضویتوں کو پیدا کرتی ہے، ان اعمال میں حس سے احساس حافظہ، انتخاب اور اپنے تجربے کے اجزا کی ترتیب دینے والی قوتوں کا اظہار ہوتا ہے تاکہ ذات کا ماحول سے اور ماحول کا ذات سے بہتر تطابق ہو سکے۔

حیات کے ان مظاہر کا عالم حیاتیات اور عالم نفسیات مطالعہ کرتے ہیں، ان کو سادہ الفاظ میں بیان کرتے اور ان کا اصطفاف کرتے ہیں اور ان تمام مخصوص صفات کو منضبط کرتے ہیں۔ لیکن فلسفہ کا طالب علم حیات کے ان مظاہر ہی کو جاننے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اسکی ماہیت کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ پوچھتا ہے کہ حیات و ذہن اپنی اصل و مائیت کے لحاظ سے کیا ہیں؟ ان کا ظہور کیوں اور کس طرح ہوا؟ کیا یہ ایک نئی قسم کی حقیقتیں ہیں یا محض ہم ان ہی سادہ صورتوں کا مجموعہ ہیں جو غیر عضوی عالم میں پائے جاتے ہیں؟ غیر عضوی عالم میں ذرات اور سالمات ہی کی جلوہ گری دیکھتے ہیں۔ سالمات اپنے خاص خاص الف کے لحاظ سے بے شمار مرکبات میں ترکیب اختیار کرتے ہیں۔ لیکن ان کیمیائی مرکبات کی زندہ اجسام میں کس طرح "عضویت" ہوتی ہے اور عضویت کے ساتھ یہ تمام عجیب و غریب خصوصیات مثلاً تحفظ ذات، تولید مثل نوعی وغیرہ کا کس طرح بروز ہوتا ہے؟ کیا غیر عضوی کیمیائی مرکبات میں جوہر حیات نفوذ کرتا ہے اور یہ مادی ذرات و سالمات اور ان کے تمام مرکبات سے نوعیت و ماہیت کے لحاظ سے مختلف چیز ہے یا ان ہی ذرات و سالمات کے اختیار کردہ ایک خاص ساخت یا صورت کا محض تفاعل؟ تاریخ فلسفہ میں اکثر دفعہ یہ مانا گیا ہے کہ حیات مادہ میں متمکن ضرور ہوتی ہے لیکن وہ خود مادہ نہیں، یہ مادہ اور میکانکی قوتوں کی تمام صورتوں سے بالکل جدا ہے یہ ایک بے مثل شے ہے جو مادی توانائی پر حکمرانی کرتی ہے اس نظریہ کو "نظریہ نفس حیوانی" یا بلفظ واحد "حیاتیت" کہا گیا ہے کچھ اسی قسم کا نظریہ **ارسطو** مانتا تھا اور زمانہ حال کے بعض مشہور علماء حیاتیات (مثلاً ڈریش، رینکے) کا بھی یہی مسلک ہے۔ اسکے برخلاف ہر صدی کے اکثر

فلسفی اور زمانہ گزشتہ اور زمانۂ حال کے اکثر علماء حیاتیات ہر قسم کے نفس حیوانی کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور انکا یقین ہے کہ حیات معمولی طبعی کیمیائی قوتوں کی فعلیت کا نتیجہ ہے، یہ کوئی جداگانہ جوہر یا قوت نہیں اس نظریہ کو عموماً میکانیت، کہا جاتا ہے۔ یہ کائنات کے اس نظریہ سے قریبی تعلق رکھتا ہے جسکو ہم "فطریت" کہنے لگے ہیں۔

میکانیت

مکانیت کی مزید توضیح نہایت سادہ الفاظ میں کیجاسکتی ہے میکانیت کا اصول یہ ہے کہ حیات ـــــ خواہ خردبین سے نظر آنے والے عضویتوں کی حیات ہو یا پودوں کی ہو یا حیوانات کی ہو یا انسان کی ہو جملہ حیات کی تشفی بخش توجیہ ان ہی قوتوں یا مواد کے ذریعہ کیجانی چاہئے جو غیر عضوی یا مادی فطرت میں پائے جاتے ہیں مثلاً جو زمین چٹانوں یا کیمیائی مرکبات میں موجود ہیں۔ زندگی کی تمام صورتیں حتیٰ کہ ذہن کی توجیہ کیلئے بھی طبعی اور کیمیائی قوانین کافی ہیں۔ جب ہولر نے ۱۸۲۷ء میں گیس کے عمل میں "یوریہ" کو ترکیب دیا اسی زمانہ سے یہ یقین اور بڑھ گیا کہ عضویات کے سارے اعمال کیمیائی قوانین سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ ہربرٹ اسپنسر نے آسانی سے اس امر کو ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ حیات و غیر حیات کا فرق محض نابت مایہ کے سالمات کی پیچیدگی اور نیٹروجن کے مرکبات کے درجوں کا فرق ہے۔ ان تمام کو مادہ اور حرکت کے حدود میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ آخری تحلیل میں یہ اجزائے مادی کی مکان میں حرکت قرار پاتے ہیں۔ جسم انسانی اسکے عجیب و غریب دماغ اسکے نظام عصبی کو لو، پھر پودوں اور حیوانات کو لو۔ ان دو کی کیمیائی تحلیل کرنے کے بعد تمہیں وہی کاربن، آکسیجن۔ ہیڈروجن۔ کیلسیم کے مرکبات نظر آتے ہیں۔ جو وہ بڑے کیمیائی عناصر مثلاً زمین، چٹان، پانی وغیرہ میں نظر آئیں گے۔ پروٹیڈ جسکی وجہ سے عضوی مادہ غیر عضوی مادہ سے ممتاز کیا جاسکتا ہے اور جو مصنوعی طریقے سے پیدا نہیں کیا جاسکتا ان ہی عناصر میں تحلیل ہو جاتا ہے اور کوئی نئی چیز باقی نہیں رہجاتی جو ان عناصر میں قابل تحلیل نہ ہو اور نہ کوئی ایسی قوت یہاں سرگرم عمل معلوم ہوتی جو غیر عضوی اجسام میں نہ ملتی ہو" ذی حیات عضویہ طبعی کیمیائی میکانیت کا ایک مرکب نظام ہے" سادہ ترین صورت سے لیکر مرکب ترین صورت تک وہی ایک قسم کا تسلسل فطرت میں پایا جاتا ہے عضوی اور غیر

عضوی میں کوئی نمایاں حد فاصل نہیں۔

میکانیت کے انکارات نہایت دلچسپ ہیں۔ حیات کی توجیہ کے لئے کسی قسم کی پر اسرار حیاتی قوت کا فرض کرنا ضروری نہیں۔ انسان میں صرف وہی چیزیں پائی جاتی ہیں جو فطری علل سے ماخوذ ہیں جنکی یہ پیداوار ہے۔ انسان کی "روح" سے اگر یہ مراد لیجائے کہ یہ فطرت سے کوئی جدا شئے ہے تو پھر کسی روح کا وجود نہیں جب روح ہی کا وجود نہیں تو حیات بعد الموت لغو چیز ہے، بقا کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ ہماری زندگی اور اعمال کے دائمی نتائج باقی رہ سکتے ہیں اور بعد کی آنیوالی نسلیں انہیں یاد رکھ سکتی ہیں۔ اور جب فطرت کی یکسانیت عمل میں رخنہ انداز ہونیوالی کوئی مافوق فطرت شئے نہیں تو معجزات اور خدا کا بھی وجود نہیں۔ دعائیں بے معنی اعمال ہیں، ہاں شاید ان کا جمالیاتی یا انتظامی یا طبی اثر ہو۔ اسی طرح ارادہ کی آزادی یا اختیار "ناممکن چیز ہے"۔ کردار انسانی پر جن قوانین کی حکمرانی ہے یہ وہی قوانین ہیں جو سیارات و ذرات کی حرکتوں پر حکومت کر رہے ہیں"۔ عقل و شعور بھی دنیا کے ابتدائی و مستقل و دائمی واقعات سے نہیں۔ انسان میں جس قسم کی ذہنیت پائی جاتی ہے اس کا ارتقا بھی ادنی عضویتوں سے ہوا اور شاید بالآخر غیر ذی حیات اشیاء سے اور آخر میں چل کر پھر عقل کا شعلہ بجھ جائے گا۔ دائمی چیزیں (یعنی ذرات مادی) نہ فکر کرتی ہیں اور نہ منصوبے باندھتی ہیں۔ کائنات من حیث کل میں نہ عقل ہے اور نہ کوئی غائت و مقصد اور نہ کوئی قدر و قیمت۔ اس طرح میکانیت کی رو سے دنیا کی اسکیم نہایت سادہ ہو جاتی ہے اور سارے وہ تصورات جو مابعد الطبعیات میں مابہا النزاع ہیں ایکدم دور ہو جاتے ہیں۔

میکانیت کی مختصر تاریخ

دنیا کے متعلق میکانیت نے جو نقطہ نظر اختیار کیا ہے اس کی ابتدا یونان کے ایک مشہور فلسفی دیمقراطیس سے ہوئی ہے۔ یہ پانچویں صدی قبل مسیح میں گذرا ہی اسکے نزدیک مادہ لاتعداد و لامتناہی الصغر ذرات میں منقسم ہے جنکے اتصال و انفصال کیوجہ سے اشیاء پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہیں۔ ان ذرات کو خلا جدا کرتی ہے۔ حرکت خلا ہی میں ممکن ہے اور حرکت ہی کی وجہ سے یہ لامتناہی ذرات آپس میں ملتے اور جدا ہوتے ہیں، لہذا خلا کا وجود اسی قدر

حقیقی ہے جس قدر کہ مادہ کا۔ دیمقراطیس نے خود کہا تھا کہ "شی غیر شی سے زیادہ حقیقی نہیں"۔ دائمی حرکت ان لاتمناہی ذرات کی باہمی ترکیب کا باعث ہوتی ہے۔ حرکت کا سبب کوئی ماورائی ذات نہیں، یہ خود ذرات کی ماہیت میں شامل ہے۔ کائنات کی ہر شئی میں ہیں ذرات اور انکی حرکت کی جلوہ فرمائی نظر آتی ہے، فطرت میں ہر شئی کی ایک علت ہوتی ہے لیکن کسی غائت یا مقصد کا وجود نہیں۔

کوپرنیکس، گالیلیو، ڈیکارٹ، نیوٹن کی تصانیف نے مکانیت کی بہت ہمت افزائی کی اور مختلف حیثیتوں سے اس کو تکمیل بخشی۔

ہربرٹ اسپنسر (۱۸۲۰ء تا ۱۹۰۳ء) کے قانونِ ارتقا نے میکانیت میں وسعت پیدا کی۔ اس نے مادہ و حرکت و قوت کے عمل و تقسیم کے طریقے مدون کئے یہ بتلایا کہ ابتدائی مادہ سے لیکر معاشرت انسانی کی اعلیٰ ترین صورتوں تک ایک مسلسل تدریجی ارتقا پایا جاتا ہے، اور جن تغیرات پر یہ عمل ارتقا مبنی ہے وہ کسی فعلیت عقلی یا فکر کی رہبری سے نہیں چل رہے ہیں بلکہ کورانہ مادی یا میکانکی قوائے فطرت کا نتیجہ ہیں۔

جب ڈارون نے "قانون انتخاب فطرت" کو دریافت کیا اور نئے انواع حیوانی کی پیدائش کو سمجھایا تو میکانیت کو بڑی تقویت نصیب ہوئی کیونکہ ڈارون نے یہ ثابت کردیا کہ دنیا میں جو خارجی و باطنی تطابق یا غائیت نظر آتی ہے اسکی توجیہ میکانکی اصول کی بنا پر تنازع للبقا اور قانون انتخاب فطرت سے کیجا سکتی ہے اور دنیا کا حسن اور اسکی ترتیب کسی دانا و بینا ہستی کے وجود پر دلالت نہیں کرتی۔

پروفیسر ہکسلے نے بھی اپنی کتاب Phsical Basis of Life (حیات کی مادی اساس) میں میکانیت کی نہایت قوت کے ساتھ تائید کی ہے اور موجودہ صدی میں پروفیسر لوب نے اپنی مشہور کتاب Mechanistic Conception of Life حیات کا میکانکی تصور) میں میکانیت کی وضاحت کے ساتھ توجیہ کی ہے۔ زمانۂ حال کے اکثر علما حیاتیات نے اس نظریہ کو کارآمد مفروضہ کے طور پر تسلیم کرلیا ہے نہ کہ انتہائی فلسفہ کے طور پر۔ قرون وسطیٰ کی مدرسیت کے امام اعظم ولیم اوکم نے ایک قانون پیش کیا تھا جسکی رو سے موجودات اصول یا قوتوں کی بلاضرورت زیادتی نہ کی جانی چاہیئے۔ اسی قانون کو پیش نظر رکھتے ہوئے علماء مکانیت

نہیں چاہتے کہ سوائے طبعی و کیمیائی قوتوں کے کسی اور قوت کے وجود کو تسلیم کریں جب تک کہ اسکی شدید ضرورت محسوس نہ ہو چونکہ حیات اور اس کے اعلیٰ مظاہر کی توجیہ ان ہی قوتوں سے کیجاسکتی ہے لہذا کسی اور حیاتی اصول یا جوہر قوت کا فرض کرنا اسی قدر مضحکہ خیز ہوگا جس قدر کہ افیون کے نیند لانے والے اثرات کی توجیہ کیلئے یہ کہنا کہ افیون "خواب آور خاصیت" رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ عالم حیاتیات کو تفصیل کے ساتھ یہ دریافت کرنا چاہئیے کہ جب افیون کھائی جاتی ہے تو عضویت میں کیا تغیرات وقوع پذیر ہوتے ہیں، تب ہی اسکو کچھ معلوم ہوگا کہ افیون خواب آور کیوں ہے۔ اسی طرح اس کو یہ دریافت کرنا ہے کہ مثلاً جب پروانہ شمع کو دیکھتا ہے تو اس کے جسم میں کیا تغیرات پیدا ہوتے ہیں۔ پروانہ کی آنکھوں کے بعض حصے روشنی سے متاثر ہوتے ہیں، اسکے بعد عضلات میں عصبی ردعمل کی وجہ سے کشش پیدا ہوتی ہے۔ اب ہمیں کسی قدر تفصیل کے ساتھ یہ معلوم ہوا کہ کیوں پروانہ شمع کی طرف بڑھتا ہے لیکن اگر یہ کہدیا جائے کہ پروانہ کی یہ ایک "جبلت" ہے یا "جوش حیات" ہے یا کردار کا ایک جدید بروز کردہ قانون ہے تو یہ تفصیلی توجیہ سے کنارہ کشی ہوگی۔ اسی لئے اکثر علما حیاتیات حیاتیت کو سودمند نہیں خیال کرتے۔

میکانیت کی مشکلات

بادی النظر میں حیات کی میکانکی توجیہ نہایت سادہ اور دلچسپ اور قطعی نظر آتی ہے۔ لیکن اس پر نہایت سنجیدہ اور سنگین اعتراضات عائد کئے جاتے ہیں ان میں سے بعض پر ہم یہاں غور کرینگے۔

(۱) حیات یا زندہ عضویہ کو ایک مادی مشین کی طرح طبعی و کیمیائی قوانین کے ذریعہ نہیں سمجھایا جاسکتا۔ بقول پروفیسر جے، آر تھر ٹامسن کے اگر عضویہ کو مشین کہا جائے تو یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ یہ کس قسم کی مشین ہے، یہ اپنی آپ مرمت کرتی ہے، اپنی آپ حفاظت کرتی ہے، تطابق ذات رکھتی ہے، اپنی مثل ذات آپ پیدا کرتی ہے اسمیں استمرار ذات پایا جاتا ہے۔ ہربرٹ اسپنسر جو میکانیت کا زبردست امام گزرا ہے۔ حیات کی تعریف یہ کرتا ہے کہ "یہ باطنی حالات کا خارجی حالات کے ساتھ ایک مسلسل تطابق ہے" اس تعریف کی بناء پر حیات کی میکانی

توجیہ مشکل نظر آتی ہے۔ کسی مادی مشین میں تو نہ تطابق ذات پایا جاتا ہے اور نہ تحفظ ذات۔ علاوہ ازیں عالم حیاتیات جانتا ہے کہ عضویہ بالذات ایک تاریخی ہستی ہے بالفاظ دیگر اسکی ایک مخصوص علامت وہ قابلیت ہے جسکی وجہ سے وہ زمانہ ماضی کا اپنی ذات میں اندراج کرتی ہے۔ کلفرڈ نے اس راز فاش کو پہلی مرتبہ اس طرح ادا کیا تھا "زندہ موجودات کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ماحول کے زیر اثر محض بدلتے ہی نہیں رہتے بلکہ جو بھی تغیر انکی ذات میں ہوتا ہے وہ مفقود نہیں ہوجاتا بلکہ محفوظ کرلیا جاتا ہے گویا کہ عضویت میں جاگزیں ہوجاتا ہے تاکہ آئندہ افعال کی بنیاد کا کام دے" چنانچہ برگسان نے بھی اس تصور پر زور دیکر ایک عظیم الشان خدمت انجام دی ہے۔)

غرض ان خاص صفات کو جو ذی حیات مادہ کو غیر ذی حیات مادہ سے ممیز کرتے ہیں طبیعیات اور کیمیا کے ضابطے نہ کافی طور پر بیان کرسکتے ہیں اور نہ انکی توجیہ کرسکتے ہیں۔ ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ذی حیات موجودات نشو ونما کرتی ہیں، اپنے لئے موزوں غذا کا انتخاب کرتی ہیں۔ ماحول سے تطابق قائم کرتی ہیں، تہیج کا احساس کرتی ہیں، اپنی حفاظت کرتی ہیں اور تولید و تناسل کا عمل جاری رکھ کر اپنی نوع کا ازدیاد کرتی ہیں لیکن ہمیں ان قوتوں کی توجیہ کے لئے خود ان قوتوں سے زیادہ سادہ الفاظ نہیں مل سکتے، ہمیں حیاتیات کے ان ابتدائی تصورات کو میکانکی تصورات (مادہ، حرکت، توانائی، برق وغیرہ) کی طرح ضروری اور قطعی ماننا پڑتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے میں تحویل نہیں کیا جاسکتا، طبیعیات اور کیمیا کے تعقلات کو حیات انسان اور اس کے توجیہ کا کوئی حق حاصل نہیں، چنانچہ جی، ایس ہالڈین کہتا ہے کہ مادی کائنات کے متعلق یہ خیال کہ وہ واجب بالذات مادہ اور انرجی کا عالم ہے ایک وقتیہ و عملی مفروضہ ہے جس کے ذریعہ ہم اپنے تجربہ کے ایک بڑے حصہ میں ایک ترتیب و توافق پیدا کرسکتے ہیں۔ لیکن یہ مفروضہ حیات کے مظاہر کی توجیہ میں بالکل ٹوٹ جاتا ہے، کیونکہ یہاں پر ہمیں حقیقت کا ایک بنیادی طور پر مختلف تصور داخل کرنا پڑتا ہے۔ ہالڈین کی رو سے حیات کا تصور مادہ اور انرجی کے تصورات کے بہ نسبت حقیقت سے زیادہ قریب ہے، لہذا آئڈیل حیاتیات کا مفروض مقدم یہ ہے کہ بالآخر غیر نامیاتی مظاہر کی نامیاتی مظاہر میں تحویل ہوسکتی ہے اور یہ طبیعی دنیا ایک عمیق تر حقیقت کا محض ایک ظہور ہے جو ہماری نگاہ سے مستور ہے اور جو صرف حکیمانہ (سائنٹیفک) ایمان کی آنکھ کو

وسہندلی طور پر دکھائی دے سکتی ہے۔"

(۲) اعمالِ حیات کو مادہ اور حرکت کے حدود میں بیان کرنے کی کوشش کے مشکلات کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے۔ جب ہم بعض نمایاں واقعات میں غور کرتے ہیں۔ بعض ان اعمال پر غور کرو جنکو جرمنی کے مشہور عالم ڈریشیں اور اٹلی کے مشہور فلسفی پروفیسر گنانو نے اپنے "حیاتی غائت" والے فطریہ کی تائید میں بیان کئے ہیں۔

(ا) جنین کے نشو و نما کے اعمال پر غور کرو۔ اگر اس کے نشو و نما کے حالات بالکلیہ بدل ہی دیئے جائیں مثلاً اس کو الٹ بھی دیا جائے تو بھی اکثر انواع میں تکمل عضویہ کی بالکل وہی صورت ہوگی۔ گویا کہ ان حالات میں کسی قسم کا تغیر ہی نہیں کیا گیا۔ دوران نشو و نما میں، خصوصاً ابتدائی مراتب میں، ہم جنین کے بعض عضو علیحدہ کر ڈ سکتے ہیں، سر کی ابتدائی صورت کاٹ دے سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تکمل عضویت اتنی ہی کامل ہوگی جتنی کہ وہ طبعی حالات میں ہو سکتی تھی

(ب) بالغ العمر عضویہ کے باز وجود پذیر، اعمال پر غور کرو اگر خارجی حالات میں اتنا شدید تغیر بھی ہو جائے کہ بعض عضو قطع کر دیا جائے تو دوسرے عضو کے وظائف یا افعال خود اختیار کر لیتے ہیں یہانتک کہ مقطوعہ عضو پھر اپنی اصلی صورت پر آجاتا ہے۔ مثلاً بامنی کا ہاتھ کاٹ دیں تو نیا ہاتھ پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح کیکڑے کا پیر اڑا دیں تو نیا پیر پیدا ہو جاتا ہے بجمۃ البحر کا بازو کٹ جائے تو پھر نیا بازو پیدا ہو جاتا ہے۔ ادنیٰ نوع کی عضویتوں میں اگر ایک کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں تو بعض مثالوں میں مقطوعہ اجزا پھر علیحدہ علیحدہ جانور بن جاتے ہیں۔

(ج) ان حیاتیاتی اعمال سے بڑھ کر ہم عضویاتی اعمال کی طرف توجہ کرتے ہیں تو ہم پاتے ہیں بالغ العمر عضویے باوجود خارجی طبعی کیمیائی ماحول کے یکساں تغیرات کے سالہائے سال تک غیر متغیر رہتے ہیں برخلاف اس کے ان حالات کے اثر سے غیر نامیاتی اجسام میں کافی تغیرات پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً اگر ایک ہموار زمین پر رہنے والا بلند پہاڑ کی آب و ہوا میں منتقل کر دیا جائے، یا ایک تازہ ہوا میں رہنے والے کو چند گھنٹے کاربانک ایسڈ سے بھری ہوئی جگہ میں رکھا جائے تو تنفس کے اعمال میں تو تغیر پیدا ہو جاتا ہے لیکن خون میں آکسیجن کی مقدار

اتنی ہی رہتی ہے جتنی کہ پہلے تھی۔ اگر کسی عضویہ پر ایک وقت میں ایک قسم کے جراثیم حملہ کرتے ہیں اور دوسرے وقت دوسرے قسم کے جراثیم، اور ان میں سے ہر قسم مختلف ٹاکسن پیدا کرتی ہے، تو عضویہ ایک وقت ایک قسم کی انٹی ٹاکسن پیدا کرتا ہے اور دوسرے وقت دوسرے قسم کی، بہرحال اپنی طبعی عضویاتی حرکت کو برقرار رکھتا ہے۔

زندہ عضویتوں کے ان اعمال پر غور کرنے سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا طرز عمل کسی طرح محض مشین کی طرح نہیں جس کا تعین میکانکی قوتوں سے ہوا ہو جو خارج سے عمل کرتے ہیں۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی اہم قوت کے آلات ہیں جو ان کے ذریعہ عمل کر رہی ہے اور ایک غائت یا انجام کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اسی "غائت" کے متعلق فرانس کا مشہور عالم فلسفی پروفیسر امیل بوترو کہتا ہے کہ "زندہ موجودات میں ایک چیز ایسی ہے جو سائنس کی موجودہ حالت میں ناقابل فہم دکھائی دیتی ہے یعنی طبیعی کیمیائی قوتوں میں اسکی تحویل نہیں کیجاسکتی یہ چیز جو میکانکی توجیہہ سے بچ نکلتی ہے کیا ہے؟ یہ غائت کا ایک اصول ہے جو نہایت ابتدائی حیاتی مظاہر میں بھی خلقی طور پر پایا جاتا ہے۔ زندہ ہستی کی تحویل ہم تجزیہ میں کرتے ہیں، اسکا وظیفہ خارجی فعلیتوں کے زیر اثر ردعمل ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس میں اختیار نام کو نہیں، ردعمل عمل کے مساوی ہے۔ لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ردعمل کسی ایک قسم کا ردعمل نہیں، اسکی خصوصیت کا کامل بیان نہ ہوگا اگر اسکی تعریف صرف کمیت کے نقطۂ نظر سے کیجائے۔ کیوں کہ اس میں ایک غیر متوقعہ خاصیت یہ پائی جاتی ہے کہ وہ نہ صرف فرد کے تحفظ کی بلکہ اس کے نشو و نما اور تولید کی بھی مساعدت و اہتمام کرتا ہے۔ تاثر پذیری کے عمل کا اظہار نقصانات سے ہوتا ہی اب عضوی مادہ کا ردعمل ٹھیک اس طرح ہوتا ہے کہ ان نقصانات کی تلافی ہو جائے۔ علاوہ ازیں یہ ردعمل اس طرح کرتا ہے کہ ماحول سے تطابق حاصل ہو، اپنے لئے مختلف حالات میں زندہ رہنا ممکن ہو سکے۔ مختصر یہ کہ تولید مثل نوعی کی عمل سے وہ اس صورت کی بقا کی حفاظت کرتا ہے جس کا یہ نمائندہ ہے.......... ظاہر ہے کہ زندہ ہستی میں ایک باطنی غائت پائی جاتی ہے۔ زندہ ہستی بحیثیت ایک فرد ہونے کے اپنی بقا کے لئے ان چیزوں سے استفادہ حاصل کرتی ہے جو اسکے اطراف پائے جاتے ہیں۔ حرکت اضطراری جو اسکی خصوصیت ہے دو حیثیتیں رکھتی ہے ایک جس کا تعلق طبیعیات اور کیمیا سے ہے، دوسرے وہ جو ان علوم کے اشیا میں کوئی

مماثلت نہیں رکھتی۔

ہماری اس تفصیل تکرار سے۔ یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ حیات ایک خود مختار قوۃ ہے جسکے اپنے قوانین اور اپنے اصطلاحات ہیں۔ حیات کشمکش و پیکار ہے، اس میں استمرار، تنازع للبقا اور ماحول سے تطابق پیدا کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے، وہ ارادۂ حیات ہے خارجی حالات سے باطنی حالات کا مسلسل تطابق ہے۔ بقول برگساں حیات مبدع ہے اور اپنے تطابقات میں بھی مبدع و مخترع ہے، حیات انتخاب کرتی ہے، اختیار کرتی ہے، جنین سے لیکر پختہ عضویت تک میں ہم اسی اختیار، انتخاب عزم کو پاتے ہیں، بہر طور حیات حقیقت کی ایک جدید صورت ہے جو مادہ اور حرکت کے میکانکی حدود میں قابل توجیہہ نہیں۔

حیاتیت

میکانیت کے نظریہ کے چند مشکلات کا اوپر ذکر ہوا، اسی قبیل کی اور حیران کن مشکلات کی وجہ سے حیاتیت کا نظریہ پیش کیا جاتا ہے۔ جو اس انتہائی مسئلہ کی توجیہ میں ان مشکلات سے بچنے کی کوشش کرتا ہے،

حیاتیت اپنی ایجابی اور بنیادی شکل میں اس نظریہ کا نام ہے جو حیات کی توجیہ کیلئے ایک غیر مادی قوۃ یا شئی (روح یا نفس حیوانی) کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ زیادہ تنقیدی طور پر یہ حیات کی مبہم و مہمل میکانکی توجیہ کے خلاف احتجاج ہے۔ زمانۂ قدیم میں ارسطو نے روح کو مبدء حیات قرار دیا تھا۔ اس کے نزدیک روح تمام زندہ اشیاء کی ماہیت ہے، فعلیت حیات کا باعث روح ہے نباتات میں ایک قسم کی نباتی روح پائی جاتی ہے، حیوانات میں نباتی اور حسی روح اور انسان میں نباتی، حسی اور عقلی روح۔ قرون وسطی میں ارسطو کا تتبع کرتے ہوئے۔ یہ عام طور پر یقین کیا جاتا تھا کہ مبدء حیات مادہ سے علحدہ شئی ہے، یہ روحانی شئی ہے،

سترہویں صدی میں ڈیکارٹ نے ارسطو کے مقبول عام نظریہ کے خلاف یہ تعلیم دی کہ پودوں اور حیوانوں میں روح نہیں پائی جاتی، ان کے جسم محض مشین ہیں اور ان کی کل مادی قوتوں کے ہاتھ ہوتی ہے، یہ طبعی کیمیائی قوانین کے زیر اثر کام کرتے ہیں۔ ڈیکارٹ نے انسان کے جسم کو بھی اس قاعدے سے مستثنی نہیں قرار دیا

لیکن وہ انسان میں روح کے وجود کا قائل تھا جو جسم پر حکمرانی کرتی ہے اور حرام مغز میں اپنا مسکن رکھتی ہے۔ ڈیکارٹ کے بعد جب محققین نے رُوح کے پایہ تخت میں اس کی تلاش کی اور اس کو نہ پایا تو تمام انسانی شخصیت پر میکانکی اصول کا اطلاق کیا اور روح کا تصور بالکل ساقط گیا۔ میکانیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ علمار سائنس میں نفس حیوانی، یا روح، کا خیال جو نباتات یا حیوانات کے اجسام پر کسی خاص جگہ سے حکمرانی کرتی ہے مضحکہ خیز قرار پایا کیونکہ حیات کے معمل میں نہ اس کے متعلق کوئی عملی تجربات کئے جاسکتے ہیں اور نہ کوئی حکیمانہ اختبارات۔

میکانیت کی تاریخ پر نظر کرتے ہوئے جب ہم موجودہ زمانہ میں "حیاتیت" کو پھر زندہ پاتے ہیں تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ کیوں کہ جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا حیات کے اعمال کو ہم طبیعی کیمیائی اعمال میں تحویل نہیں کرسکتے۔ چنانچہ ہانس ڈریش، جو "جدید حیاتیت" کا لیڈر ہے، تجرباتی شہادت پر اپنے نتائج کی بنیاد قائم کرکے یہ ثابت کرتا ہے "حیات کی توجیہ میکانی اصول پر نہیں کیجاسکتی۔" "حیاتیات علی طبیعیات یا کیمیا نہیں حیات ایک مستقل اور جدا شئے ہے اور حیاتیات ایک مستقل سائنس" (دیکھو اوپر صـــ میکانیت کے مشکلات)

علاوہ ازیں ڈریش کا یہ یقین ہے کہ حیات ایک غیر مادی چیز کی موجودگی کی وجہ سے پائی جاتی ہے جو بالکل مختلف و مغائر ہے۔ وہ مکان میں نہیں لیکن مکان کے اندر عمل کرتی ہے، یا وہ مادی عضویہ میں نہیں ہوتی بلکہ اس میں صرف اپنا اظہار کرتی ہے۔ اس چیز کو وہ (Entelechy) یا "صورت" کہتا ہے اور بعض دفعہ اسکو (Psychoid) یا "نفسیہ" کہتا ہے۔ ان میں سے پہلا لفظ ارسطو سے ماخوذ ہے جس کے معنی "تکمیل بخش ذات" کے ہیں اور دوسرے لفظ سے ڈریش کا یہ یقین ظاہر ہوتا ہے کہ حیات کا یہ مبدا اپنی ماہیت میں ذہنی یا نفسی ہے۔ اکثر علما حیاتیات "حیاتیت" کے احیاء کو تصوف کا از سر نو پیدا ہونا سمجھتے ہیں لیکن تاہم ان کی ایک تعجب خیز تعداد نے "جدید حیاتیت" کو قبول کرلیا ہے۔ چنانچہ علاوہ برگساں اور ردو الفاسکن جیسے شہرہ آفاق فلسفیوں کے پروفیسر جے لے ٹامسن (جو اپنی حیاتیت کو "طریقیاتی حیاتیت" کہتا ہے) اور پروفیسر جے یس ہالڈین قابل ذکر ہیں۔ جے بی سمٹس نے اپنی کتاب (Holism & Evolution) میں ہولزم

کا لفظ "نفس حیوانی" کے لئے تراشا ہے اور اُس کا یقین ہے کہ یہ حقیقت کے ہر درجہ میں ملتا ہے۔

تبصرہ

ہم نے اوپر میکانیت کے نظریہ کی مشکلات کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حیات کی توجیہ طبیعی کیمیائی طریقہ پر نہیں کیجاسکتی۔ میکانیت کے خلاف "حیاتیت" کا یہ احتجاج درست نظر آتا ہے۔ لیکن کیا یہ سارے مشکلات کسی "نفس حیوانی" "صورت" یا "نفسیہ" کے فرض کر لینے سے رفع ہوجاتے ہیں؟ ان کے فرض کر لینے سے کیا ہمارا مطلب صرف یہ نہیں ہوتا کہ مادہ اور مادی قوتوں سے ذی حیات موجودات کے مخصوص صفات کی توجیہ نہیں ہوسکتی۔ اسی لئے ہمیں ایک "نفس حیوانی" کا داخل کرنا ضروری ہے۔ اہل میکانیت بجا طور پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ چونکہ حیاتیہ نفس حیوانی کی کوئی سائینٹفک تعریف نہیں پیش کرسکتے اور نہ ہی اس کا کوئی اختیاری تعین کیا جاسکتا ہے لہذا اسکی سائنس کے لئے کوئی قدر و قیمت نہیں ہوسکتی۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حیاتیہ اس امر پر مجبور نہیں کہ اسکی تعریف جسم کی میکانیت کے حدود میں کریں کیونکہ ابتدا ہی سے اسکو وہ اس طرح قابل تعریف نہیں سمجھتے، انکے مفروضہ ہی کی رو سے وہ غیر جسمانی ہے۔

لیکن جیسا کہ پٹیرک بتلاتا ہے کہ اگر حیاتیت کے حامی بجائے نفس حیوانی، یا جوہر حیات، کے تسلیم کرنیکے قوت حیات یا حیاتی توانائی (Biotic Energy) کا ذکر کریں جو مختلف میکانکی توانائیوں کے ہم رتبہ ہو، جو ایک دوسرے پر عمل کرتے ہوں تو پھر اہل میکانیت کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یا اگر حیاتیت کے قائلین کہیں کہ حیاتیت سے انکی مراد اسکے سوا کچھ نہیں کہ ایک عضویت یا ترتیب بخشنے والی فعلیت پائی جاتی ہے جو میکانکی تعامل اور طبیعی توانائیوں کے بقا میں کسی طرح مزاحم نہیں ہوتی تو پھر اہل میکانیت کو کسی قسم کا اہم اعتراض نہیں ہوسکتا۔

ممکن ہے کہ اس خیال سے ہمیں ایسا راستہ مل جائے جو میکانیت کے قدیم تنازع کو دور کرسکے۔ پٹیرک اس نظریہ کیلئے "ارتقائے تخلیقی" کا نام بہتر سمجھتا ہے گو یہ برگساں کے نظریہ سے کسی قدر مختلف ہے اور ارتقائے بارزہ (Emergent Evolution) کے بنیادی اصول پر مبنی ہے جو اور مختلف ناموں سے مشہور ہے۔

ارتقائے تخلیقی

ہم ارتقا کے نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں ہمارے نظریہ کی رو سے حیات غیر ذی حیات عناصر کی عضویت (Organization) یا ترکیب کا نتیجہ ہے۔ زندہ جسم میں کوئی پراسرار وجود، پر غموض ہستی حلول کئے ہوئے نہیں جسکو ہم جوہر حیات، یا نباتاتی یا حسی روح کہیں۔ حیات کی ساری مخصوص صفتیں، قوتیں، مثلاً نشو ونما، تولید مثل نوعی تحفظ ذات تطابق ذات وغیرہ عضویت، ترکیب و ساخت کا نتیجہ ہیں۔ یہاں تک تو اہل میکانیت بھی ساتھ دے سکیں گے۔

لیکن ہم عضویت، کو بغیر کسی عضویت بخش فعلیت کے تسلیم نہیں کر سکتے۔ جو تمام ترکیب ساخت، عضویت کا مبدء ہے شاید اکثر مخالفین مادیت اس امر پر اصرار نہ کریں کہ یہ محض اتفاق کا نتیجہ ہے اور اگر اتفاق کا لفظ وہ استعمال بھی کریں تو ان کی مراد صرف یہ ہوتی ہوگی کہ عضویت کے علل و اسباب کے متعلق ہمیں علم نہیں۔ ہمارے نظریہ کے ان دو اجزا کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ سمجھنا ضروری ہے۔

نظریۂ ارتقائے تخلیقی کی رو سے اگر واقعات فطری کے باترتیب تسلسل پر تاریخی نظر ڈالی جائے تو ہمیں وقتاً فوقتاً کوئی بالکل نئی چیز ظہور پذیر ہوتی نظر آتی ہے۔" ارتقا کا ہر قدم "ترکیب تخلیقی" کی وجہ سے وجود کا ایک جدید درجہ پیش کرتا ہے۔ "ترکیب تخلیقی" کے معنی سوا اسکے کچھ نہیں کہ عناصر میں ایک ترکیب رونما ہوتی اور اسکی وجہ سے نئے اعمال نئی قوتیں اور نئی فعلیتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں یا خلق ہوتی ہیں۔ اکثر ان کی جواہر (ذرات) میں عضویت ہوتی ہے، جواہر کی سالمات میں، سالمات کی خلیات میں، خلیات کی زندہ اجسام میں اور ترکیب و عضویت کے ہر درجہ پر نئے صفات کا ظہور ہوتا ہے۔ جن عناصر کی تخلیقی ترکیب سے انکا بروز ہوا ہے ان کے محض جمع کرنے سے انکا استاج نہیں کیا جا سکتا، اسی واسطے انہیں جدید مخلوقات کہنا بجا ہوگا۔ مثلاً آکسیجن اور ہیڈروجن کی عضویت سے پانی کے ایک سالمہ کی تخلیق ہوتی ہے۔ پانی میں ایسے صفات ہیں جو آکسیجن اور ہیڈروجن میں نہیں اور نہ ان صفات کی پیشین گوئی ان دو عناصر کے کامل علم سے ہو سکتی تھی۔ پانی پودوں

اور حیوانوں کی پیاس کو بجھاتا ہے، آکسیجن اور ہیڈروجن میں یہ صفت نہیں نہ یہ تر ہیں۔ پانی کا سالمہ تو نسبتہً نہایت سادہ ساخت رکھتا ہے۔ لیکن جب زینہ بہ زینہ اور درجہ بدرجہ مرکب ترین ساخت والی چیز زندہ مادہ ظہور پذیر ہوتا ہے تو جدید صفات کا سلسلہ بروز کرتا ہے مثلاً نشوونما، تاثر پذیری، تطابق اور تولید مثل نوعی وغیرہ وغیرہ۔ یہ ممتاز خصوصیتیں ان عناصر کے صفات کا محض مجموعہ نہیں جنکی عضویت یا ساخت سے یہ بروز کرتی ہیں۔ یہاں دو اور دو چار نہیں۔ یعنی بے شمار نئی صفتیں چند عناصر کے عضویت یا ترکیب تخلیقی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے بروز کا لفظ خاص معنی میں استعمال کیا گیا ہے جس میں میکانکی مساوات کا تصور داخل نہیں ہر نئے درجہ کے نئے صفات اور قوانین نیچے کے درجہ کے صفات و قوانین سے منتج نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ کیمیائی قوانین حرکت کے عام قوانین سے منتج نہیں قرار دیئے جا سکتے کیونکہ مختلف مرکبات کی ساخت و عضویت سے ایک نیا جز پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح حیاتیات کے قوانین سے نہیں منتج کیا جا سکتا۔ ہر درجہ کے قوانین کا انکشاف کیا جانا چاہیئے نہ کہ استناج۔ سائنس کا کام فطرت کے قوانین کو دریافت کرکے ایک تسلسل منتظم قائم کرنا ہے۔ ارتقا کے اس نظریہ کی رو سے مختلف درجوں کے اشیاء کا عمل مختلف ہوتا ہے اور جو قوانین ان کے اعمال رنگ کا تعین کرتے ہیں وہ ایک دوسرے سے منتج و ماخوذ نہیں ہوتے۔

مختصر یہ کہ جب **ارتقا** کے ہر زینہ پر نئی صفتیں نئی قوتیں مادہ کی ترکیب تخلیقی عضویت کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں تو حیات بھی اسی قسم کی ایک نئی حقیقت ہے جو سادہ تر عناصر کی عضویت پاکر مرکب صورت اختیار کرنے پر منصۂ ظہور پر آتی ہے۔ لہذا ایک جدید فاعلیت۔ غیر مادی اور غیر مدرک۔ کو داخل کرنے کے بجائے ہم واقعہ کا اظہار اس طرح کر سکتے ہیں کہ حیات مادہ اور حرکت کے حدود میں قابل توجیہ نہیں بلکہ تمام عضوئے۔ جو ہماری حواس کو تجزیایہ کا مجموعہ نظر آتے ہیں، حقیقت کے نئے پہلو کا اظہار کرتے ہیں جو میکانکی بیانات کے حدود سے باہر ہیں،

فعلیت تخلیقی

ارتقائے تخلیقی کا دوسرا جز جو قابل تفصیل ہے وہ عضویت بخشنے والی فعلیت یا مبدء ہے۔ ذات

سالمات کا محض اجتماع تو اتفاق سے سمجھایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ دیمقراطیس نے کائنات میں کسی غائت یا مقصد یا رہبری کرنیوالی فعلیت کو ماننے کے بغیر اشیاء کے ابتداء کی توجیہ ان ہی ذرات کے اتفاقی اتصال وانفصال سے کی تھی۔ لیکن اس کے لئے بھی اس نے حرکت اور تجاذبی قوتوں کو فرض کرلیا تھا حرکت کو اس نے ذرات کی ماہیت میں شامل تسلیم کیا تھا۔ لیکن زندہ عضویہ کی توجیہ کرنا بالکل جدا چیز ہے، یہاں ہمیں ایسی قوۃ کی ضرورت ہے جو (جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا ہے) میکانکی قوتوں کے بالکل مخالف ہے ہمیں ایک تخلیقی قوۃ کی ضرورت ہے جو دنیا کو زینہ بزینہ اعلیٰ درجوں تک لیجارہی ہے خود ارتقاء کی توجیہ کیلئے تخلیقی ترکیب اور عضویت کی توجیہ کے لئے، حیات کی توجیہ کیلئے اور شاید خود مادّی کی توجیہ کیلئے ہمیں کسی تخلیقی قوۃ کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اس قسم کی تخلیقی فعلیت ہر مذہب میں اور اکثر فلسفیانہ نظامات میں تسلیم کی گئی ہے۔

فلسفیانہ نظامات پر اگر ہم ایک سرسری نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ عبرانی فلسفہ میں خدا کو خالق ارض و سما مانا گیا۔ "ابتدا میں خدا نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا"۔ ارسطو کے فلسفہ میں فعلیت تخلیقی کو محرک اول یا خدا کہا گیا ہے۔ فلاطون کے پاس یہ ڈمی آرگس یا صانع خلق ہے فلاطون اور ارسطو سے پہلے انکساغورث نے اس کو "نوس" یا ذہن کہا تھا۔ فلسفۂ جدید میں برونو اور اسپنوزا اسکو (Natura Naturans) کہتے ہیں۔ فشٹے انیغو مطلق، شلنگ، خالص تخلیقی توانائی، ہیگل، تصور مطلق، شوپنہور، ارادہ مطلق، نیٹشے ارادہ قوۃ فان ہارٹمن، غیر شعوری ارادہ، فشنر روح، ونٹ ارادہ کلی، اسپنسر ناقابل علم، موجودہ زمانہ کے تصوریہ ذات مطلق کہتے ہیں، اور بے شمار فلسفوں میں یہ محض خدا کہلاتا ہے۔

لیکن کیا علماء حیاتیات میں بھی کسی نے اس قسم کی تخلیقی قوۃ کو تسلیم کیا ہے؟ کیا ان دنوں حیاتیات میں کوئی ایسی تخلیقی قوۃ مانی جاتی ہے جس کو ارسطو نے باطنی تکمیل بخش اصول، کہا تھا، یا جس کو برنارڈ شا متعدد دفعہ "قوۃ حیات" سے تعبیر کرتا ہے، یا جس کو گوئٹے نشو ونما کی باطنی قوۃ، کہتا تھا۔ یا جس کو ڈرایش "نفسیہ" یا "صورت" کہتا ہے؟

ہم یہاں چند سر برآوردہ علماء حیاتیات کے خیالات پیش کرینگے جن پر غور کرنے سے ہمیں اس سوال کا جواب ایجاب میں مل سکتا ہے۔ ڈرشیں کے متعلق تو ہم نے دیکھا کہ وہ اور اسکے ہم خیال حیاتیہ بعض ایسے غیر میکانکی فعلیتوں کے قائل ہیں جو طبیعی کیمیائی قوتوں کے دائرہ سے باہر ہیں۔ بعض دفعہ اور زیادہ عام طور پر یہ فعلیتیں ارادی قوۃ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں جو حیات عضوی کے دائرہ میں سرگرم عمل ہیں مثلاً "ڈارون کا" تنازع للبقا" نے گیلی کا وہ باطنی جز جو کمال کے طرف مائل ہے (Vervolk Komungsprinzip) یا جیڈز اور ٹامسن کا "ابداعی تہیج" (Originative impulse) جس کے متعلق وہ کہتے ہے کہ "اس قسم کے ابداعی تہیج کے عضویت میں ماننے پر ہم مجبور ہیں جو تغیر و تحول اور ہر قسم کے تخلیقی سعی و کوشش میں اپنا اظہار کرتا ہے" البرٹ پی میا تیہوز اس کو "آزادی کے لئے پیکار" کہتا ہے۔ اس ابتدائی گل میں جس سے زندگی کا آغاز ہوا ہے ایک قابلیت موجود تھی جسکو میکانکی فلسفہ نے نظر انداز کیا ہے۔ وہ ماحول سے مقابلہ کرنے کی قابلیت ہے۔ یہ زندگی کی اصل ہے۔ زندگی پیکار کا نام ہے۔ جان بروز نامیاتی دنیا میں ایک ایسی چیز کو تسلیم کرنا ضروری سمجھتا ہے جسکو وہ عضویت بخش مبدء کہتا ہے۔ انتخاب فطرت تخلیقی قوۃ نہیں بلکہ وہ محض میکانکی عمل ہے۔ اتفاق یا اتفاقی انتخاب نامیاتی یا غیر نامیاتی دائروں میں یکساں عمل کرتے ہیں۔ لیکن غیر نامیاتی دنیا میں وہ نئی صورتوں کی تکمیل کا باعث نہیں ہوتے۔ کیونکہ یہاں تکمیل و ترقی کا مبدء نہیں پایا جاتا، اور نہ کوئی عضویت بخش تہیج لیکن نامیاتی مادہ میں ایک تکمیل بخش مبدء یا میلان پایا جاتا ہے، قوت حیات دوسری صورتوں تک پہونچنے کیلئے ساعی ہے، بالفاظ دیگر تکمیل و ارتقاء اسلئے ہو رہا ہے کہ کوئی چیز تکمیل و ارتقاء کیلئے موجود ہے۔ بلوط میں نشو و نما و تکمیل ہوتی ہے لیکن مردہ کی کنکریوں میں صرف تغیر ہوتا ہے۔

پھر ہم خاص طور پر ایک مخصوص قوۃ یا توانائی کا ذکر سنتے ہیں جو توانائی کی اور مسلمہ صورتوں کے مانند ہے مثلاً بنجامن مُور کی حیاتی توانائی (Biotic Energy) اسی طرح جان ہیور ہڈ میا کفرلین کیلئے حیات، ذہن اور ارتقاء کی توجیہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہم علاوہ توانائی کے مشہور و مسلّمہ طبیعی صورتوں کے اور مخصوص صورتوں کو تسلیم نہ کریں مثلاً حیاتی توانائی وغیرہ۔ مارکس ہارٹاگ کا یقین ہے کہ

حیات کی توجیہ عضویوں میں ایک نئی قوۃ کی موجودگی ہی سے کیجا سکتی ہے جو ایک معلوم طبیعی قوۃ سے جدا ہے۔ اس نئی قوت کو وہ (Mitokinetism) کہتا ہے۔

بعض دفعہ اس تخلیقی فعلیت کو ایک کائناتی تہیج مانا گیا ہے جو خود حیات سے زیادہ بنیادی ہے۔ چنانچہ برگساں اپنی کتاب ارتقائے تخلیقی میں (Elan Vitol) (تہیج حیات) کو کائنات کی اصل و بنیاد قرار دیتا ہے جو ارتقا کا مبدء و منبع ہے ارتقا کے جہت کو اور خود ارتقا کو تعین کر رہا ہے۔ ابتدائی ذی حیات صورتوں میں، نغزنایہ کے باریک تاروں میں وہ زبردست باطنی جوش قوت پنہاں تھی جو اسکو "حیات کی اعلیٰ ترین صورتوں تک پہونچانے والی تھی۔

اس ارتقائے تہیج، اس باطنی رہبری کرنے والی قوت کی فطرت و نوعیت کا ٹھیک طور پر تعین کرنے کی کوششیں کم کی گئی ہیں۔ بہرحال یہ میکانکی دائرہ کے بالکل باہر ہے اور ایک قسم کی تخلیقی قوت نظرآتی ہے جو طبیعی قوتوں کی رہبری کرتی ہے اور ان کو ترتیب دیتی ہے لائیڈ مارگن اپنی کتاب Emergent Evolution) میں کہتا ہے کہ ہمیں ایک ابتدائی (اوریجنل) فعلیت کو ماننا پڑتا ہے جو تمام ارتقاء کے وقوع کا باعث ہے وہ اس فعلیت کی ذہن یا روح سے تعبیر کرتا ہے لیکن اسکو محض خدا کہنا بہتر سمجھتا ہے اور اس امر کا بھی اشارہ کرتا ہے کہ یہ ادہر سے کھینچنے والی قوت ہے۔

اسی طرح اڈنگٹن اپنی کتاب (Space, Time & Gravitation) میں اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ شعور کی ماہیت ہی کے مانند کوئی شئے دنیا کا اصلی مواد ہے۔ ایک نہایت بلیغ عبارت میں وہ اپنے خیال کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ:۔

"ہم نے نامعلوم کے ساحل پر ایک عجیب وغریب نشان پایا یا۔ اس کے ابتدائی توجیہ کیلئے ہم نے یکے بعد دیگرے عمیق نظریات بنائے۔ آخر کار ہم اس ہستی کی تشکیل میں کامیاب ہوئے جس کے یہ نشان پا ہیں۔ مگر دیکھنا! یہ تو ہمارے ہی نشان پا ہیں۔

بالآخر ہم حیات کی ماہیت اور اسکی ہدایت کے مشکل مسئلہ کا کیا حل پیش کرسکتے ہیں؟ مسئلہ نہایت

بنیادی اور عظیم الشان ہے!! اور یہ کا قول یاد آتا ہے کہ ع کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمہ را۔ حیات کے متعلق دونوں مروجہ نظریات میکانیت و حیاتیت پر ہم نے نظر تنقید ڈالی اور دونوں کو غیر تشفی بخش پایا۔ جس نظریہ کو ہم نے ارتقائے تخلیقی کے نام سے بیان کیا ہے۔ اس سے اس مشکل ترین مسئلہ پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے اس نظریہ کی رو سے نامیاتی اور غیر نامیاتی میں کوئی حد فاصل نہیں۔ ایک فعلیت سارے ارتقا کے تحت سرگرم عمل ہے۔ ساری فطرت سلسلہ تخلیق کا ایک عمل ہے جس کے ہر مرحلہ پر نئی قوتیں نئی قابلیتیں، نئے صفات نئی قیمتیں خلق ہو رہی ہیں! ان میں کے نہایت عظیم الشان تخلیقات یہ ہیں — حیات، ذہن، شعور، جماعت، تاریخ، فن، ادب، سائنس، فلسفہ، مذہب، قصہ دراز ہے، باب کے باب مفقود ہیں!

حیات، ذہن وغیرہ عملِ ارتقا کی کامیابیاں تصور کی جا سکتی ہیں۔ عمل ارتقا کے پیچھے عضویت بخش فعلیت، تہیج ابتدائی، ارادۂ تخلیقی پنہاں ہے، اس تخلیقی قوت نے ذرات، طبیعی توانائیاں، مکان، زمان وغیرہ کا اپنی اپنی جگہ استعمال کیا اور ان کو ترتیب دی ہے۔ یہ بجائے خود زیادہ اہم نہیں۔ ساخت اور صورت اہم حقائق ہیں۔

پروین

ایک سماجی ڈرامہ

تین ایکٹ میں

از

مولوی میر حسن صاحب بی اے

افراد ڈرامہ

(۱) الطاف۔ ایک قدامت پسند اور پابند وضع معمر کاروباری
(۲) زمرد۔ اس کی سمجھدار بیوی
(۳) شمیم۔ الطاف کا بڑا بیٹا
(۴) لطیف۔ شمیم کا چھوٹا بھائی
(۵) سعیدہ۔ لطیف اور شمیم کی بہن
(۶) پروین۔ شمیم کی معشوقہ
(۷) مہدی۔ لطیف کا دوست
(۸) بختاور۔ الطاف کی خادمہ

پہلا ایکٹ

(رہائش کا کمرہ فرنیچر سے اچھی طرح آراستہ ہے
الطاف حسین اور زمرد بیگم کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں)

زمرد ۔ آپ پھر باہر جا رہے ہیں؟

الطاف ۔ ہاں۔ ایک کام پر جا رہا ہوں۔ بچے کہاں ہیں۔ کوئی بھی نظر نہیں آتا۔

زمرد ۔ دونوں غائب ہیں ـــــ وہی سینما دیکھنے گئے ہونگے۔

الطاف ۔ دونوں بہت مل جل کر رہتے ہیں۔

زمرد ۔ واقعہ ہے لیکن اب وہ میرے قابو سے باہر ہوے جا رہے ہیں۔

الطاف ۔ ہاں سمجھدار ہو گئے ہیں۔

زمرد ۔ (برہم ہوکر) سمجھ آگئی ہے تو میری اور بھی اطاعت کرنی چاہیئے۔ آپ چونکہ بے اعتنائی برتتے ہیں، اسلئے بچوں پر بھی اس کا اثر ہوا ہے ـــــ مجھے اس سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

الطاف ۔ اس کے بعد پوتوں کی باری بھی تو آئے گی۔

زمرد ۔ (مسکراکر) ممکن ہے میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں شمیم کی شادی کی فکر کرنی چاہیئے۔

الطاف ۔ میرا بھی یہی خیال ہے میں سمجھتا ہوں ہارون خاں کی لڑکی رابعہ

زمرد ۔ رابعہ! نہیں شمیم کو اس سے نفرت ہے۔

الطاف ۔ ہونے دو۔ پاجی کو ماں باپ کا کچھ بھی لحاظ نہیں۔ اپنی ہی مرضی کے مطابق کام کرنا چاہتا ہے

زمرد ۔ جوانی میں تم نے بھی تو ایسا ہی کیا ہوگا۔

الطاف ۔ لیکن میں نے ہر قسم کی محنت اٹھا کر اپنے آپ کو اس سے کہیں زیادہ کار آمد ثابت کر دکھایا۔

زمرد ۔ وقت آئیگا تو شمیم بھی محنت سے جی نہ چرائیگا۔

الطاف۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ زندگی میں کامیاب رہے گا؟

زمرد۔ بیشک شمیم آپ سے زیادہ چالاک ہے۔

الطاف۔ یہ تمہارا خیال ہے۔ البتہ وہ بالکل بیوقوف تو معلوم نہیں ہوتا۔

زمرد۔ جی وہ ہرگز بیوقوف نہیں ہے۔ اب تو اسے قابو میں رکھنا مشکل ہے۔

الطاف۔ یہ اُسکی عقلمندی نہیں، بلکہ تمہاری بیوقوفی کا ثبوت ہے۔

زمرد۔ میں بیوقوف ہوں، اس لئے تمہیں اپنے قابو میں رکھتی ہوں۔

الطاف۔ (کوئی جواب نہیں دیتا)

زمرد۔ بہرحال رابعہ کا خیال فضول ہے۔

الطاف۔ شاید وہ اتنی حسین نہیں کہ تمہارے لڑکے کو متوجہ کر سکے ـــــ اچھا تمہارے ذہن میں کوئی لڑکی ہے؟

زمرد۔ ہاں

الطاف۔ وہ کون

زمرد۔ اقبال حسین کی لڑکی خدیجہ

الطاف۔ ٹھیک ہے۔ اس نسبت سے تو شمیم انکار نہیں کر سکتا۔

زمرد۔ پھر کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے؟

الطاف۔ نہیں لیکن رابعہ سے شادی ہو جاتی تو بہتر ہوتا۔ پھر تمہاری مرضی ـــ خدیجہ ہی سہی لیکن ہمیں بہت جلد قطعی فیصلہ کر لینا چاہیئے۔

زمرد۔ شمیم کے آتے ہی اس کا ذکر کئے دیتی ہوں۔

الطاف۔ ہاں، ضرور۔ یہ خبر سنکر وہ بہت خوش ہو جائے گا

(بجتا ور داخل ہوتی ہے)

بختاور ۔ سرکار موٹر تیار ہے۔

الطاف ۔ اچھا

(بختاور چلی جاتی ہے)

زمرد ۔ آپ کب تک لوٹیں گے ؟

الطاف ۔ ایک بجے تک آجاؤں گا۔

زمرد ۔ آپ راتوں میں بھی دیر دیر تک باہر رہنے لگے ہیں۔

الطاف ۔ لیکن تم جانتی ہو ــــ یہ سب صرف بچوں کی بہبودی کے لئے ہے۔

زمرد ۔ ممکن ہے۔

دونوں چلے جاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد زمرد لوٹ کر چیزوں کو قرینے سے رکھنے میں مصروف ہو جاتی ہے باہر سے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے شمیم اور لطیف داخل ہوتے ہیں

سینما سے اب فرصت ہوئی ۔

جواب میں دونوں خاموش ہو جاتے اور پھر جانے کیلئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

زمرد ۔ شمیم ٹھیرو تم سے کچھ کہنا ہے۔

شمیم ۔ امی ...... مجھے بھی آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔

لطیف چلا جاتا ہے

زمرد ۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو ؟

شمیم ۔ امی آپ کیا کہنا چاہتی ہیں ؟

زمرد ۔ تم پہلے بولو

شمیم ۔ نہیں امی آپ کہیئے۔

زمرد ۔ ممکن ہے ہم دونوں کے دل میں ایک ہی بات ہو،

شمیم ۔ ایسا ہوا تو مجھے بڑی مسرت ہوگی۔
زمرد ۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہی بات ہے۔
شمیم ۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ میرے دل کی بات بیان کرسکینگی۔
زمرد ۔ اچھا تو تم کیا کہنا چاہتے ہو ؟
شمیم ۔ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں ؟
زمرد ۔ میں اپنے لفظ کا پہلا حرف بتلائے دیتی ہوں ـــــ وہ ش سے شروع ہوتا ہے۔ شمیم تم جانتے ہو کہ اب تمہاری عمر.........
شمیم ۔ میرے لفظ کا پہلا حرف س ہے۔
زمرد ۔ اچھا وہ لفظ کیا ہے۔
شمیم ۔ آپ کا لفظ غالبًا شادی ہے۔
زمرد ۔ تمہارا لفظ......... کیا وہ بھی شادی کے ہم معنے ہے۔
شمیم ۔ نہیں، اُسے شادی سے کوئی تعلق نہیں۔
زمرد ۔ بہرحال تمہاری شادی ہوجانی چاہئے ـــ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں اُسے ذرا غور سے سنو۔
شمیم ۔ بیشک آپ جو کہینگی اسی پر عمل کروں گا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شادی سے پہلے بعض ممالک کا سفر ضروری ہے۔
زمرد ۔ سفر
شمیم ۔ جی ہاں، تقریبًا تین سال کے لئے
زمرد ۔ (تعجب سے) تین سال ؟
شمیم ۔ جی ہاں ۔ صرف تین سال
زمرد ۔ (خاص انداز میں) صرف تین سال ۔ واپسی پر تم چوبیس سال کے ہو جاؤگے اور خدیجہ

میں ۲ سال کی ہو جائے گی۔

شمیم۔ مجھے اُس کی عمر سے کوئی سروکار نہیں۔ چاہے وہ تیس سال کی ہو جائے یا ترسٹھ سال کی۔

زمرد۔ تم خدیجہ سے بھی راضی نہیں ہو،

شمیم۔ نہیں میں اس سے بھی شادی نہیں کروں گا۔

زمرد۔ آخر وجہ؟

شمیم۔ وجہ اور سبب تو نہیں بتلا سکتا البتہ اتنا کہے دیتا ہوں کہ یہ نسبت مجھے پسند نہیں

زمرد۔ تو پھر رابعہ کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔

شمیم۔ یہ رابعہ کون ہے؟

زمرد۔ وہی اقبال حسین کی لڑکی۔

شمیم۔ میری نظر میں رابعہ اور خدیجہ دونوں برابر ہیں۔

زمرد۔ لیکن تمہارے ابا کی یہی خواہش ہے۔ تم اس سے شادی کر لو۔

شمیم۔ کس قدر مضحکہ خیز خواہش ہے۔

زمرد۔ (برہم ہو کر) تم اپنے باپ کے خیال کو مضحکہ خیز سمجھتے ہو!

شمیم۔ اگر ان کا یہی خیال ہے تو وہ فی الحقیقت مضحکہ خیز آدمی ہیں —— خیر تو یہ فرمائیے کہ آپ مجھے سفر کی اجازت دینگی یا نہیں؟

زمرد۔ سوچ کر جواب دونگی۔ یہ بتلاؤ کہ تم کس لئے جانا چاہتے ہو۔ یہ خیال کب اور کیوں کر پیدا ہوا۔

شمیم۔ یہ ایک عام حقیقت ہے کہ بغیر سفر کے تعلیم مکمل نہیں ہوتی۔ اور پھر جبکہ ہمارا طرز تعلیم اس قدر ناقص ہے۔

گذشتہ زمانہ میں ایک ملک سے دوسرے ملک کو جانے میں سینکڑوں دقتیں اور بے شمار

رکاوٹیں تھیں اس کے باوجود تجربہ اور معلومات حاصل کرنے کی غرض سے لوگ بڑے بڑے سفر کیا کرتے تھے لیکن اب یہ دشواریاں باقی نہیں رہیں۔ اس زمانہ میں تو سفر میں گھر سے زیادہ آرام و سکون پیدا ہوتا ہے اور مختلف قسم کے لوگوں سے ملنے جلنے کا موقع ملتا ہے۔

زمرد۔ اس سے فائدہ؟

شمیم۔ وہی جو ابا جان کو کلب سے حاصل ہوتا ہے۔

زمرد۔ تمہارے ابا مجبور ہیں۔ انہیں کاروبار کے سلسلہ میں لوگوں سے ملنا ہی پڑتا ہے

شمیم۔ کاروبار۔ کیا اسکی صرف یہی وجہ ہے؟

زمرد۔ اور کیا؟

شمیم۔ خیر تو مجھے وہ فوائد حاصل ہونگے جو ابا جان کو تھیٹر میں حاصل ہوتے ہیں۔

زمرد۔ اگر صرف یہی وجہ ہے تو تمہیں سفر کی اجازت ہرگز نہیں دیجائے گی۔

شمیم۔ کیوں؟

زمرد۔ اسلئے کہ انہیں ان چیزوں کیلئے وقت ملتا ہے لیکن تمہیں اپنا وقت ان خرافات میں ضائع نہیں کرنا چاہیئے ـــــ تمہیں زندگی کے میدان میں داخل ہونا ہے۔

شمیم۔ کیا ابا جان روپیہ ہمارے لئے نہیں کماتے؟

زمرد۔ ہرگز نہیں۔

شمیم۔ پھر کس غرض سے کماتے ہیں؟

زمرد۔ میں نہیں جانتی۔

شمیم۔ آپ نہیں جانتیں! اچھا میں بتلاتا ہوں انسان اپنی بیوی بچوں کے آرام کیلئے روپیہ کماتا ہے۔ تاکہ وہ آرام اور عزت سے بسر کرسکیں۔ کیا آپ کو اس سے اختلاف ہے؟

زمرد۔ میں نہیں جانتی۔

شمیم۔ ممکن ہے خود ابا جان نہ جانتے ہوں لیکن اگر ایسا نہ ہو تو روپیہ کمانے کا کوئی تک نہیں یا دولت کو اکٹھا کر کے نسلاً بعد نسلاً چھوڑنے کا قائل نہیں۔ ابا جان کی کمائی کا ایک اچھا مصرف نکالنا چاہتا ہوں ایسا روپیہ جو مسرت کے حصول میں صرف نہ کیا جائے بلکہ اپنے مالک کیلئے ایک بوجھ ثابت ہو مفلسی سے بدتر ہے۔

زمرد۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ بہرحال اُن سے گفتگو کرنے کے بعد اپنی رائے بیان کرونگی۔ شادی کا تصفیہ تمہارے جانے سے پہلے ہی ہو جانا چاہئے۔

شمیم۔ نہیں، واپسی کے بعد دیکھا جائے گا۔ پچیس سال کی عمر سے پہلے میں ہرگز شادی نہیں کر سکتا۔

زمرد۔ آخر کیوں؟

شمیم۔ اس لئے کہ بالفعل میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

زمرد۔ تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو۔ اکثر لڑکے بائیس اور تیئیس سال کی عمر میں شادی کر لیتے ہیں۔

شمیم۔ میں اسے جلد بازی سمجھتا ہوں۔ پچیس سال کے اندر صحیح معنیٰ میں شادی ہو ہی نہیں سکتی۔

زمرد۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔

شمیم۔ آپ کا نہ سمجھنا ہی بہتر ہے۔ بہرحال سفر سے پہلے میں اس جنجال میں پڑنا نہیں چاہتا۔

زمرد۔ دیکھو شمیم، اگر تم نے کسی غیر ملکی لڑکی سے شادی کر لی تو یہ چیز میرے لئے ناقابل برداشت ہو جائیگی۔

شمیم۔ ہرگز نہیں۔ نہ صرف اس لئے کہ آپ اسے ناپسند کرتی ہیں بلکہ اس لئے کہ ایک تو مجھے غیر ملکیوں سے دلی نفرت ہے۔ دوسرے وہ اپنا وطن چھوڑ کر ایسے گھر میں رہنا کب پسند کریگی؟

زمرد۔ تمہاری باتیں میری سمجھ میں ہی نہیں آتیں۔

شمیم۔ نہیں آپ سب کچھ سمجھتی ہیں۔

زمرد۔ شمیم آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ آج تم بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔

شمیم۔ جی، میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ سفر کی اجازت دیجئے میرے علم اور تجربہ میں اضافہ ہوگا

زمرد۔ کیا تم جلد سے جلد واپس ہونے کا وعدہ کرتے ہو؟

شمیم۔ ہاں، تین سال کے بعد فوراً واپس آجاؤں گا۔

زمرد۔ دیکھو تمہارے ابا کیا کہتے ہیں۔ وہ آتے ہی ہونگے۔

زمرد چلی جاتی ہے۔ شمیم سوچ میں غرق بیٹھا رہتا ہے۔ کچھ دیر بعد پروین داخل ہوتی ہے۔ شمیم سے چار آنکھیں ہوتی ہیں تو مسکرا دیتی ہے۔

شمیم۔ (خاص آواز میں) پروین

پروین۔ فرمائیے۔

شمیم۔ میں بہت جلد یہاں سے جا رہا ہوں۔

پروین۔ (بدحواسی سے) کہاں، کس لئے؟

شمیم۔ کچھ روز کے لئے سفر پر جا رہا ہوں۔

پروین۔ کیا واقعی؟

شمیم۔ (ضبط کرکے) ہاں، تین سال بعد بڑا آدمی بنکر لوٹونگا۔

پروین۔ آپ .... تین سال تک سفر پر رہیں گے۔

شمیم۔ ہاں، تین سال تک جرمنی میں رہونگا۔ میرا یہاں ٹھہرنا تمہارے لئے انتہائی خطرناک ثابت ہوگا۔

پروین۔ کیوں؟

شمیم۔ (اُس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیکر دباتے ہوے) اس لئے کہ مجھے تم سے محبت ہے۔

—— (پردہ) ——

دوسرا ایکٹ

کمرہ مغربی وضع پر سجا ہوا ہے۔ لطیف میز کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے

تحریر کردہ حصہ کو آواز سے پڑھنے کے لئے رکتا ہے۔

لطیف۔ "بھائی جان۔ عنایت نامہ کا شکریہ قبول فرمائیے۔ کاش میں بھی آپ کے ہمراہ ہوتا لیکن ابا جان اجازت نہ دیں گے ــــ کچھ دنوں سے ایک قسم کی بے چینی محسوس کر رہا ہوں کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ (اسکی آواز میں خفیف سا ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے) حسب معمول پروین کا خط بھی روانہ کر رہا ہوں اُسے ہمیشہ آپ کے خط کا انتظار رہتا ہے۔ اور جب کبھی آپ کا خط دیتا ہوں اس کا چہرہ مسرت سے جگمگا اٹھتا ہے۔

اپنا خط تہہ کر کے ایک دوسرے لفافہ کے ساتھ جو پہلے ہی سے بند اور سربمہر ہے، ایک اور لفافہ میں بند کرتا ہے۔ بجنا اور داخل ہوتی ہے ایک لفافہ دیکر چلی جاتی ہے لطیف، خط کھولتا ہے اسمیں سے ایک چھوٹا سا سربمہر خط نکالتا ہے اتنے میں پروین داخل ہوتی ہے

پروین۔ (لطیف کے ہاتھ میں خط دیکھ کر مستفسر انداز میں) چھوٹے میاں۔

(لطیف چھوٹا لفافہ اسکو دیتا ہے۔ وہ شکریہ ادا کرتی ہے۔)

پروین۔ آپ نے وہ خط بھیجدیا جو میں نے کچھ دیر قبل دیا تھا

لطیف۔ نہیں، وہ ابھی میرے ہی پاس ہے۔

(بند لفافہ بتلاتا ہے)

پروین۔ مجھے اس میں کچھ اور لکھنا ہے۔

لطیف۔ شام کو جواب لکھوں گا۔ تم اس کے ساتھ ایک مزید نوٹ بھیج سکتی ہو۔

پروین۔ لیکن میں نے خط نہ لکھنے کی شکایت لکھی تھی۔ اس جملہ کو بدلنا ہے۔

لطیف۔ کیوں! انکے یہاں سے خط آکر کتنا عرصہ گزرا آپ جانتے ہیں۔

پروین۔ تقریباً ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔

لطیف۔ اچھا جو کچھ لکھا ہے اُسے ویسا ہی رہنے دو۔ اس سے تمہارے اشتیاق کا پتہ چلے گا۔ کل دوسرا خط تو روانہ کر ہی رہی ہو۔

پروین۔ بہت اچھا۔

لطیف۔ آج رات میں لکھ لو۔

پروین۔ (لطیف کی طرف خاص نظروں سے دیکھتے ہوئے) بہت خوب۔

پروین چلی جاتی ہے۔ لطیف اسکی طرف بغور دیکھتا اور ٹھنڈی سانس بھر کر بھائی کے خط پر نظر ڈالتا ہے.............. زمرد داخل ہوتی ہے

لطیف۔ آیئے امی جان۔

زمرد داخل ہو کر لطیف کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔

زمرد۔ یہ خط کہاں سے آیا؟

لطیف۔ بھائی جان کے یہاں سے۔

زمرد۔ اچھا! کیا لکھا ہے۔

لطیف۔ سب کی خیریت پوچھی ہے اور آداب و سلام لکھا ہے۔

زمرد۔ لطیف مجھے خوشی ہوتی ہے کہ شمیم تمہیں اکثر خطوط لکھا کرتا ہے۔ دور دراز مقام پر بھی اسے ہمارا خیال رہتا ہے۔

لطیف۔ جی ہاں۔ کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

زمرد۔ لطیف مجھے تم سے کچھ دریافت کرنا ہے۔

لطیف۔ فرمایئے۔

زمرد ۔ اس مسئلہ پر میں تمہارے ابا سے بھی گفتگو کر چکی ہوں ۔

لطیف ۔ کس مسئلہ پر

زمرد (قدرے توقف کے بعد ایک خاص انداز میں) دیکھو کچھ روز سے پروین تمہارے کمرے میں اکثر آیا جایا کرتی ہے، اور تم دیر دیر تک اُس سے بات چیت کرتے رہتے ہو۔ .... تمام نوکر کانا پھوسی کر رہے ہیں، ذرا احتیاط سے کام لو، ایسا نہ ہو کہ یہ رسوائی دور تک جا پہونچے ۔

لطیف (پریشانی سے) کیا کوئی ایسی افواہیں مشہور ہیں ۔

زمرد ۔ ہاں ۔ مجھے تم سے کوئی بدگمانی نہیں لیکن ان افواہوں کی تہہ میں کچھ حقیقت ضرور معلوم ہوتی ہے خود میری طبیعت گوارا نہیں کرتی تھی کہ اس معاملہ میں تم سے گفتگو کروں لیکن یاد رکھو اگر تم سے فی الحقیقت کسی قسم کی لغزش ہوگئی تو کوئی علاج نہ بن پڑیگا ۔

لطیف ۔ کوئی بات بھی تو ہو ۔ آخر یہ خیال آپ کو کس طرح پیدا ہوگیا ۔

زمرد ۔ کیا تم یقین سے کہہ رہے ہو کہ کوئی بات نہیں ۔

لطیف ۔ بالکل یقین سے ۔

زمرد ۔ بہر حال تم دونوں جوان ہو، خدا معلوم کیا آن پڑے ۔ اس لئے میں پروین کو گھر سے باہر نکال دیتی ہوں

لطیف ۔ ہیں ۔ گھر سے نکال دوگی ۔

زمرد ۔ ہاں

لطیف ۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو بیچاری کی زندگی تباہ ہوجائے گی ۔

زمرد ۔ میں مجبور ہوں ۔

لطیف ۔ نہیں، یہ ناممکن ہے ۔ مجھ سے ہرگز نہ دیکھا جائے گا ۔

زمرد ۔ تم ابھی کہہ چکے ہو کہ کوئی بات نہیں ہے ۔ اس لئے تمہیں اس کے رہنے یا چلے جانے سے کوئی دلچسپی نہ ہونی چاہیئے ۔

لطیف ۔ میں مجبور ہوں۔

زمرد ۔ افوہ ۔ مجبور ہو ۔ پھر تو یہ تمام افواہیں بالکل صحیح ہیں۔ اُسے فوراً نکال باہر کرنا چاہئیے......تم اس معاملہ میں دم بھی نہیں مار سکتے۔

(زمرد جانے کے لئے کھڑی ہو جاتی ہے)

لطیف ۔ امی جان

زمرد ۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔

(زمرد جانا چاہتی ہے لطیف سامنے آکر روک لیتا ہے)

لطیف ۔ اگر آپ اپنے ارادہ پر تلی ہوئی ہیں تو خیر میں کچھ نہیں کر سکتا لیکن میں نہیں چاہتا کہ اسکی زندگی تلخ ہو جائے ۔ اسکے ماں باپ کی حالت سے تو آپ مجھ سے زیادہ واقف ہیں ۔ بیچاری کو نکالنا ہی ہے تو بالفعل کچھ مالی امداد ضروری ہے۔

زمرد ۔ ہیں ۔ لطیف ! ۔ تم رو کیوں رہے ہو ـــــ اچھا ـــــ اب مجھے پورا یقین ہو گیا ۔ تمام افواہیں بالکل صحیح ہیں۔

لطیف ۔ صحیح ہو یا غلط اس کا ذکر چھوڑیئے ۔ یہ بتلائے کہ آپ اسکی کسی طرح امداد کرینگی یا نہیں ؟

زمرد ۔ (کچھ سوچکر) ہاں میں اسکی امداد کرتی رہونگی ۔ لیکن تمہیں اس سے ملنے ملانے یا خط و کتابت کرنیکی اجازت نہ دی جائے گی۔

لطیف ۔ اگر آپ اسکی امداد کا وعدہ کرلیں تو مجھے یہ شرطیں منظور ہیں۔

زمرد ۔ کیا تم قطعی وعدہ کرتے ہو ؟

لطیف ۔ امی آپ کو مجھ پر کچھ بھی اعتماد نہیں ۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ آپ کو مجھ پر کوئی بھروسہ نہیں تو جو دل میں آتا کر بیٹھتا

زمرد ۔ نہیں بیٹا ۔ مجھے تم پر کامل اعتماد ہے ـــــ میں پروین کو آج ہی یہاں سے بھیجدیتی ہوں

لطیف۔ اچھی بات ہے ــــ لیکن ــــ میں اس سے ایک دفعہ گفتگو کر لینا چاہتا ہوں۔

زمرد۔ اچھا۔ لیکن یہ میری موجودگی میں ممکن ہے۔

لطیف۔ نہیں امی میں اس سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں۔

زمرد۔ تو پھر میں تمہیں ہرگز اسکی اجازت نہ دونگی۔

لطیف۔ خیر تو خط و کتابت ہی کی اجازت دیجئے۔

زمرد۔ اگر تم نے ایسی جرارت کی

لطیف۔ پیاری امی

زمرد۔ بیہودہ کہیں کا۔

لطیف۔ میں بیہودہ ہوں، لیکن آپکی باتیں مجھے پاگل بنائے دیتی ہیں۔

(جانے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے)

زمرد۔ کہاں جا رہے ہو۔

لطیف۔ پروین سے ملنے کے لیئے

زمرد۔ ٹھیرو ٹھیرو (راستہ روک کر) آخر اس سے ملنے کی کیا ضرورت ہے۔؟

لطیف۔ میں اسکو آئیندہ زندگی سے متعلق کچھ نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔

زمرد۔ تم اسکو نصیحت کروگے۔ اگر یہی بات ہے تو یہ میری موجودگی میں بھی ہو سکتا ہے۔

لطیف۔ (قدرے توقف کرکے) اچھی بات ہے موجودگی ہی میں سہی۔

(گھنٹی بجاتی ہے۔ بختاور داخل ہوتی ہے)

زمرد۔ پروین کو یہاں بھیجدے۔

بختاور۔ اچھا بیگم صاب

(بختاور چلی جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد پروین داخل ہوتی ہے)

لطیف - پروین تم سے کچھ کہنا ہے۔

پروین - فرمائیے۔ (لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے)

لطیف - میں ایک ایسی خبر سنانے والا ہوں جو تمہاری مسکراہٹ کو رنج سے بدل دیگی۔

پروین ....

لطیف - لیکن یہ تمہاری ہی بھلائی کے لئے ہے۔

پروین - (سمجھتے ہوئے) ....

لطیف - گھبراؤ نہیں (پروین دم بخود ہو جاتی ہے) میری باتیں تمہیں عجیب معلوم ہونگی لیکن ...... تمہیں چاہیئے کہ تمام دقتوں کا مقابلہ نہایت مستقل مزاجی سے کرو

پروین - (مرتعش آواز میں) میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

لطیف - تمہیں یہ سنکر تعجب ہوگا کہ تمہارے اور ہمارے متعلق اس گھر میں عجیب مضحکہ خیز افواہیں پھیل چکی ہیں جسکی بنا پر امی جان کو بڑی تشویش ہوگئی ہے۔ اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم دونوں اکثر اوقات ایک دوسرے سے ملتے اور بات چیت کرتے رہتے ہیں۔ پروین دیکھو .... تمہیں (زمرد کی طرف پلٹ کر) بقیہ باتیں آپ خود بیان کر دیجئے۔

زمرد - (پروین سے مخاطب ہوکر) تمہیں آج ہی اس گھر سے چلے جانا ہوگا (پروین پر غم اور تحیر کی حالت طاری ہو جاتی ہے) تمہارا یہاں رہنا ہمارے دونوں کیلئے ٹھیک نہیں۔

(پروین کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں)

لطیف - (دل کڑا کرکے) روتی کیوں ہو۔ یہاں سے جاؤ گی تو آرام سے رہو گی۔ میں نے امی جان سے طے کر لیا ہے۔ کسی قسم کی فکر کی ضرورت نہیں۔ کوئی تکلیف نہ ہوگی، بلکہ ایسے گھر سے چلے جانا تمہارے لئے بہتر ثابت ہوگا۔

(پروین سسکیاں لینے لگتی ہے)

تمہارے رونے سے لوگوں کی بدگمانی میں اور اضافہ ہوجائے گا۔ اسکے علاوہ رونے دھونے کی بات ہی کونسی ہے۔ یہ دیکھو کہ کیسے مقام سے رہائی پا رہی ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے کہ خدا نے یہاں کی الجھنوں سے نجات دلائی (زمرد سے) امی جان کیا آپ میری موجودگی میں پروین سے مدد کا وعدہ کرینگی؟

زمرد - ہاں میں وعدہ کرتی ہوں (پروین سے مخاطب ہوکر) اگر تجھے وہاں کوئی تکلیف ہو تو میرے پاس چلی آنا۔ میں تیری مدد کرونگی۔ میں نے تجھے اپنی بچی کی طرح پالا ہے، اور اب بھی تیری بھلائی چاہتی ہوں۔ اسلئے کوئی ضرورت پیش آئے تو بغیر پس و پیش کے میرے پاس چلی آنا۔ ہر طرح سے میں تیری مدد کرونگی۔

پروین - میں آپ کی عنایتوں کو ہرگز نہ بھول سکونگی۔

زمرد - جیسا ابھی لطیف نے کہا تجھے چاہیئے کہ تمام دقتوں کا سامنا نہایت مستقل مزاجی اور شرافت سے کرے۔

پروین - جی ....

زمرد - شادی کے بعد ہم سے ملنے کے لئے ضرور آنا۔

پروین - شکریہ

زمرد - اگر تم نے اچھا رویہ اختیار کیا تو اچھا شوہر مل ہی جائے گا۔ (جس وقت یہ دونوں باتوں میں مصروف رہتے ہیں لطیف دونوں کی نظریں بچا کر ایک کاغذ پر کچھ لکھتا ہے اور اسکو ایک کتاب میں رکھکر پروین کے حوالہ کرتا ہے)

لطیف - یہ ایک نہایت حقیر تحفہ ہے، لیکن اسے یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھو۔

پروین - شکریہ

(وہ ابھی تک رو رہی تھی لیکن سر جھکا کر بندگی کرتی ہے)

لطیف۔ امی اب سب باتیں طے ہو چکیں۔ میں اپنا وعدہ پورا کرچکا ہوں۔ اب آپ کو اپنا وعدہ وفا کرنا چاہیئے (پروین سے) خدا حافظ پروین۔ کبھی کبھی ہمارے گھر ضرور آنا۔ گو میں تم سے نہ مل سکوں گا۔

زمرد۔ اگر تم کبھی کبھی ایک دوسرے سے ملا کرو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن تم نہیں جانتے کہ یہ افواہیں بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔ اچھا اب میں جاتی ہوں۔

(پروین لطیف کی طرف بغور دیکھتی ہے۔ پھر زمرد کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ لطیف اسکی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ پھر میز پر گر کر رونے لگتا ہے۔ کچھ دیر پیروں کی آہٹ سنائی دیتی ہے لطیف آنسو پونچھ لیتا ہے)

لطیف۔ کون؟

بختاور۔ جی، بختاور

لطیف۔ کیا ہے؟

(بختاور داخل ہوتی ہے)

بختاور۔ میاں، مہدی میاں آئے ہوئے ہیں۔

لطیف۔ اچھا

(بختاور چلی جاتی ہے۔ لطیف اٹھکر اپنی صورت آئینہ میں دیکھتا ہے۔ پھر باہر جاکر کچھ دیر بعد مہدی علی کے ساتھ داخل ہوتا ہے دونوں کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں)

مہدی۔ کہیئے، کیا خبر ہے۔

لطیف۔ کچھ نہیں، آپ ہی سنائیے۔

مہدی۔ آپ ہی کوئی اچھی خبر سنائیے۔

لطیف۔ ایک خبر سناتا تو ہوں، لیکن معلوم نہیں آپ اسکو اچھی سمجھتے ہیں یا بری۔

مہدی۔ کہیئے کہیئے۔

لطیف۔ اس کے متعلق میں آپ کو پہلے ہی کہنا چاہتا تھا، لیکن موقع نہ آیا۔

مہدی۔ میں اندازہ سے کہہ سکتا ہوں کہ تم کیا کہنے والے ہو۔

لطیف۔ نہیں، شاید تمہیں بھی غلط فہمی ہوگئی ہے۔

مہدی۔ مجھے غلط فہمی ہوگئی ہے !

لطیف۔ ہاں غالباً تم یہ سمجھتے ہونگے کہ مجھے پروین سے محبت ہے۔

مہدی۔ واقعہ ہے۔

لطیف۔ لیکن تم جانتے ہو کہ مجھے اُس سے محبت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

مہدی۔ جانتا ہوں اور اسکی وجہ بھی معلوم ہے۔

لطیف۔ نہیں، اسکی وجہ سے آپ واقف نہیں ہو۔

مہدی۔ خوب! سوائے طبقہ کے اختلاف کے اور کیا وجہ ہوسکتی ہے۔

لطیف۔ اگر یہی وجہ ہوتی تو صورت حال بہت آسان ہو جاتی۔

مہدی۔ تو پھر اُس کا باپ گھر داماد لینا چاہتا ہوگا۔

لطیف۔ نہیں۔ تمہارا یہ قیاس بھی غلط ہے۔

مہدی۔ پروین کسی اور پر مرتی ہے۔

لطیف۔ ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔

مہدی۔ یہ بڑی تکلیف دہ چیز ہے۔

لطیف۔ واقعہ ہے۔ لیکن مجھے تو اس سے بھی بڑی مصیبت کا سامنا ہے۔

مہدی۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔

لطیف۔ مطلب یہ ہے کہ میں ان دونوں کا رازدار ہوں۔ وہ مجھے اپنا بہی خواہ سمجھتے ہیں اور مجھ سے امداد کی توقع رکھتے ہیں، انہیں میری محبت کا کوئی علم نہیں۔

مہدی۔ یہ بڑی ناقابل برداشت مصیبت ہے؟

لطیف۔ تم سے ناقابل برداشت سمجھو یا کچھ اور۔ لیکن یہ اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے کہ جس سے مجھے محبت ہے اُسی اسے بے التفاتی ظاہر کروں۔

مہدی۔ وہ شخص کون ہے۔ کیا کوئی اچھا آدمی ہے۔

لطیف۔ اس سے مجھے اس قدر قربت ہے کہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا.........میری مراد شمیم بھائی سے ہے

مہدی۔ شمیم؟

لطیف۔ (تھوڑی دیر توقف کرکے) مجھے پروین سے اس وقت سے پہلے سے محبت تھی جب کہ بھائی جان نے مجھ سے اپنا راز بیان کیا۔ میں نہیں اپنا رقیب سمجھکر خائف ہوگیا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ وہ جرمنی جارہے ہیں تو بڑی خوشی ہوئی۔ گو میرا ضمیر مجھے ستا رہا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ انکی دوری کی وجہ سے پروین میری ہوجائے گی۔ انکے جانے کا انتظار بے چینی سے کرتا رہا۔ وہ گھڑی خوب یاد ہے جب انہوں نے سفر کا قطعی ارادہ کرلیا۔ چاندنی رات تھی۔ میرے کمرے میں دبے پاؤں آکر انہوں نے کہا لطیف میں سفر پر جارہا ہوں میں نے کہا کہ مجھے انکے علمی ذوق کا علم تھا۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ وہ صرف ایک بہانہ تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ انہیں یہاں ٹہرنے میں اندیشہ تھا۔ یہ سنکر مجھے تعجب ہوا اور میں نے وجہ دریافت کی۔ مجھ پر کامل اعتماد ہونے کے باوجود کچھ دیر پس و پیش کیا۔ بالاخر کہنے لگے۔ تم جانتے ہو اگر میں ایک یا دو مہینے اور یہاں ٹہروں تو پروین کی زندگی تلخ ہوجائیگی ہمیں ایک دوسرے سے عشق ہے۔ اس لئے ایک جگہ رہنے میں اندیشہ ہے۔ ممکن ہے کسی وقت جذبات سے مغلوب ہوجائیں۔ اباجان اور امی شادی پر راضی نہ ہونگے۔ اسلئے میں اسکی مدد نہ کرسکوں گا۔ کیونکہ اس وقت تو میں خود اپنی مدد بھی نہیں کرسکتا۔ مجھے بھی خدشہ ہے۔ اسی وجہ سے تین سال کیلئے جرمنی جارہا ہوں۔ واپسی کے بعد ڈاکٹر شمیم کو کسی کالج کی کرسی مل ہی جائے گی۔ اب تو تم میرے سفر کا مطلب سمجھ گئے؟ ــــ اسکے بعد وہ ضبط نہ کرسکے آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ میں بے ساختہ رونے لگا۔ میں اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔ اسکے بعد انہوں نے مجھے پروین کی

خبرگیری کا وعدہ لیا۔ چونکہ اس کے نام خطوط لکھنے کی جراءت نہ ہوسکتی تھی اس لئے مشاطگی کی خدمت میرے سپرد ہوی۔ میں نے رضامندی کا اظہار کیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور سمجھے کہ میں اس فرض کو آسانی کے ساتھ انجام دے سکونگا۔ میں نے محسوس کیا کہ انکی محبت پرخلوص اور گرم جوش تھی اسلئے آخر کار اپنی محبت کو قربان کردینے کی ٹھانی۔ اُس وقت سے یہی سمجھتا رہا ہوں کہ اس سے محبت کرنا میرے لئے گناہ ہے۔ لیکن اپنے دل سے مجبور ہوں۔ ہمیشہ اسی کی لو لگی رہتی ہے جانتا ہوں کہ مجھے اپنی محبت میں کامیابی نہیں ہوسکتی۔ میری حالت بھائی جان سے بھی بدتر ہے وہ اپنے محبوب سے کچھ ہی روز کے لئے جدا ہوئے ہیں۔

مہدی۔ (ٹھنڈی سانس بھرکر) ہاں۔

لطیف۔ اور ابھی امی جان کہہ رہی تھیں کہ میں اور پروین اکثر ایک دوسرے سے گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ اسی لئے نوکروں میں مختلف قسم کی افواہیں گشت لگا رہی ہیں۔ خود امی جان کو مجھپر شبہ ہوگیا ہے اور یہ شک و شبہ واجبی بھی ہے۔ اسی وجہ سے دقتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ پروین یہاں سے چلی جارہی ہے۔

مہدی۔ چلی جارہی ہے

لطیف۔ ہاں، اسکی موجودگی میرے لئے خطرناک ہے لیکن جدائی کی تاب نہیں۔ میں محسوس کررہا ہوں کہ پروین کو چھوڑکر جاتے وقت بھائی جان پر کیا گذری ہوگی۔

(کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے اور بختاور چائے کی کشتی لیکر داخل ہوتی ہے مہدی کو بندگی کرکے کھڑی ہوجاتی ہے)

لطیف۔ کیا پروین اپنے گھر چلی گئی؟

بختاور۔ جی نہیں چھوٹے میاں۔ بڑے سرکار نے کہا کہ اس قدر اچانک چلے جانا ٹھیک نہیں۔ کل صبح تک ٹہرنا مناسب ہے۔

—(پردہ)—

تیسرا ایکٹ

پہلے ایکٹ کا کمرہ - الطاف حسین آرام کرسی پر بیٹھے چرٹ پیتے ہوئے اخبار دیکھ رہے ہیں - زمرد داخل ہوتی ہے

زمرد - آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ؟

(اُس کے قریب کی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

الطاف - (اخبار پڑھتے ہوئے) ایک معاملہ پر گفتگو کرنی ہے -

زمرد - کیا کوئی اہم مسئلہ ہے -

الطاف - نہیں - کوئی اہم بات نہیں - وہی لطیف سے متعلق کچھ کہنا ہے -

زمرد - کیوں ، آخر بات کیا ہے ؟

(اخبار رکھ دیتا ہے)

زمرد - لطیف بڑا ضدی ہوگیا ہے -

الطاف - ہاں ضد اور ہٹ تو اُسکی فطرت میں داخل ہیں -

زمرد - وہ دھن کا بڑا پکا ہے ، کسی کام کے کرلینے کا قصد کرلیتا ہے تو چاہے اُس میں کیسا ہی اندیشہ اور کتنے ہی خطرے ہوں ، اُس سے باز نہیں آتا -

الطاف - سچ کہتی ہو - عجیب لڑکا ہے - اگر غلط راستے پر نہ پڑجائے تو یقیناً آگے چل کر بہت بڑا آدمی ہوجائے گا -

زمرد - لیکن اُسے ہمارا اور خاندان کا کچھ بھی لحاظ و پاس نہیں -

الطاف - بالکل ٹھیک ہے - خدا جانتا ہے وہ میری مطلق پروا نہیں کرتا - سمجھتا ہے کہ عمر کی زیادتی کی وجہ سے میرے حواس گم ہوگئے ہیں - اسلئے میں چاہتا ہوں کہ تمام کام میری ہی مرضی کے

مطابق انجام پائیں۔

الطاف۔ یقین مانو وہ بالکل یہی سمجھتا ہے۔ اُسکی عقل اور قوت ارادی مجھ سے کہیں زیادہ اچھی ہے۔

زمرد۔ کیا آپ حقیقت میں یہی سمجھتے ہیں۔

الطاف۔ ہاں۔ میری تمام عمر محنت اور جد و جہد میں گذری ہے۔ اور لطیف کے دن آرام اور بےفکری سے بسر ہوئے ہیں۔ تعجب ہے کہ اسکے باوجود اُسکی قوت ارادی اس قدر زبردست کیسے ہوگئی!

زمرد۔ شمیم کے جانے کے بعد سے وہ بہت کچھ بدل گیا ہے نہیں معلوم کیا بات ہوگئی۔

الطاف۔ مجھے تو لطیف کچھ روز سے افسردہ اور برداشتہ خاطر معلوم ہوتا ہے۔

زمرد۔ میرا خیال ہے کہ شمیم کی واپسی کے بعد اسکا یہ رنگ باقی نہ رہیگا۔

الطاف۔ نہیں۔ تم دیکھو گی کہ لطیف شمیم پر بھی چھا جائے گا۔ شمیم بڑا جذباتی لڑکا ہے۔ لیکن اسکے ارادوں میں لطیف جیسی استواری کہاں؟ میں سمجھتا ہوں کہ کسی عورت کے جال میں پھنس جانیکے سوا شمیم سے اور کسی خطرناک حرکت کا امکان نہیں۔

زمرد۔ (چین جبیں ہوکر) گویا آپ عورتوں کو جال سمجھتے ہیں۔

الطاف۔ نہیں۔ میں تو صرف مذاق کر رہا تھا۔ بہر حال شمیم کی طرف سے مجھے اطمینان ہے۔

زمرد۔ مجھے ایسا مذاق پسند نہیں۔

الطاف۔ خیر اس کا ذکر چھوڑو۔ لطیف سے متعلق جو کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں اسکا تعلق پروین سے ہے

زمرد۔ پروین سے، ہرگز نہیں۔

الطاف۔ ہرگز نہیں! — اجی سنو آج پروین کا باپ میرے یہاں آیا تھا۔ اُس نے کہا کہ پروین نے اُس شخص سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کا انتخاب ہم نے اُسکے لئے کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں لطیف کا ہاتھ ہے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کوئی دو ہفتہ قبل لطیف پروین کے گھر گیا تھا۔

زمرد ۔ (متعجب ہوکر) کیا پروین کے باپ نے کہا۔

الطاف ۔ نہیں، نہیں ۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اور لطیف دو تو میرے خلاف سازش کر رہے ہیں ۔ میں نے ایک چال چلی اور اُس سے کہا مجھے یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ لوگوں نے لطیف کی خوب خاطر تواضع کی تو اُس نے جواب دیا ہرگز نہیں ۔ اُس کا موقع ہی نہ مل سکا ہمیں تو اُن کے یکایک آجانے سے بڑی حیرت ہوئی ۔ یہ پروین کے گھر کا واقعہ ہے ۔ مجھے یاد ہے کہ دو ہفتہ پہلے جب میں پروین کی شادی سے متعلق تم سے گفتگو کر رہا تھا، لطیف بھی اُسے کان لگا کر سن رہا تھا ۔ مجھے اسی وقت اندیشہ ہوا ۔ اسی لئے میں نے دوسرے روز تم سے پوچھا کہ لطیف کہاں ہے؟ لیکن تم تو اس قدر بے خبر رہتی ہو کہ کسی چیز کی اطلاع ہی نہیں رہتی ۔

زمرد ۔ ہاں، کیا کہنے ۔ اور آپ تو ہر معاملہ میں بڑے ہوشیار واقع ہوئے ہیں ۔

الطاف ۔ بات یہ ہے کہ میں لطیف پر پوری نگرانی رکھتا ہوں ۔ اس وجہ سے کہ مجھے اُس کے مستقبل سے بڑی دلچسپی ہے ۔

زمرد ۔ میری امیدیں تو شمیم سے وابستہ ہیں ۔

الطاف ۔ ٹھیک ہے ۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر لطیف میرا قائم مقام ہو جائے تو تمام کاروبار کا ناس ہو جائے گا ۔ خیر واقعہ تو سن لو ۔ محمد شفیع کو پروین کی شادی کے معاملات طے کرنے کے لئے بھیجا تھا جب میں نے اُس سے پوچھا کہ شادی کی خبر نے پروین کے عزیزوں اور گھر والوں پر کیا اثرات پیدا کیئے تو اُس نے کہا کہ انہوں نے کسی قسم کی حیرت یا خوشی کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی انہیں اس کی گفتگو سے دلچسپی رہی ۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ لطیف وہاں اُس سے پہلے پہونچ چکا تھا اور اُس نے تمام واقعات بیان کر دیئے تھے ۔ اور پھر جب میں نے لطیف کی موجودگی میں یہ ریمارک کیا کہ پروین نے شادی سے انکار کر دیا ہے، تو وہ دل ہی دل میں مجھ پر ہنس رہا تھا ۔ لیکن چونکہ میں اُس وقت اُس سے کچھ کہنا سننا نہیں چاہتا تھا ۔ اسلئے چشم پوشی اختیار کی ۔ نافرمان

گدھا کہیں کا۔ میرے خیال میں اُس نے تم سے کچھ وعدہ بھی کیا تھا؟

زمرد - ہاں - پروین سے نہ ملنے کا عہد کیا تھا۔

الطاف - کیا واقعی

زمرد - ہاں ہاں - شاید تم بھول گئے۔ اُس نے وعدہ کیا تھا۔ اگر میں پروین کی امداد کرتی رہوں تو وہ اُس سے ملنے ہرگز نہ جائے گا۔

الطاف - یہ اور بھی طرفہ بات ہے۔ اچھا میں تمہاری موجودگی میں لطیف سے چند سوالات کرتا ہوں لیکن یاد رکھو تم مدعی علیہ کی نہیں بلکہ مدعی کی طرف دار ہو۔ وہ بڑا گھاگھ ہے۔

زمرد - اچھی بات ہے۔

(الطاف گھنٹی بجاتا ہے۔ بختاور داخل ہوتی ہے)

الطاف - ذرا لطیف کو یہاں بھیجدے۔

بختاور - بہت خوب سرکار۔

(بختاور چلی جاتی ہے)

الطاف - کیا تم سمجھتے ہو کہ اسے ہماری تشویش کا علم نہیں۔ وہ خوب جانتا ہے کہ ہم اُس معاملہ کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔

زمرد - نہیں جی - یہ تمہارا خیال ہے۔

الطاف - اچھا گھوڑا میدان سامنے ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ پروین کا باپ مجھ سے ملنے آیا تھا۔

(لطیف آہستہ سے داخل ہو کر زمرد کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

لطیف - (الطاف سے مخاطب ہو کر) آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔

الطاف - تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔

لطیف - جب آپ نے خاص طور پر بلایا ہے تو کچھ نہ کچھ سوالات ضرور مرتب کئے ہونگے۔ اسکے علاوہ مجھے

معلوم ہے کہ آپ کیا کہنے والے ہیں۔

الطاف ۔ تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ میں کیا کہنے والا ہوں۔

لطیف ۔ پروین کے باپ سے کچھ واقعات معلوم ہوئے ہیں اسکی بنا پر۔

الطاف ۔ ہاں ۔ مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے ۔ لیکن پہلے یہ تو بتلاؤ کہ تمہیں پروین کی شادی کے معاملہ میں مداخلت کی جرات کیسے ہوی۔

لطیف ۔ بالکل غلط ۔ میں نے ہرگز کوئی مداخلت نہیں کی میں تو صرف اُسکے باپ سے ملنے کی غرض سے گیا تھا

الطاف ۔ تاکہ وہ اس نسبت کے توڑ ڈالنے پر راضی ہوجائے، کیوں یہی بات تھی نا ؟

لطیف ۔ مجھے پروین پر کامل اعتماد ہے ۔ اسکے باوجود اگر اسکا باپ شادی کے معاملہ میں اُسے مجبور کرتا تو بڑی دشواری پیش آتی اس لئے میں اس معاملہ میں خود پروین کی رضامندی کی اہمیت کو ثابت کرنے کے لئے گیا تھا۔

الطاف ۔ تم عجیب قسم کی گفتگو کررہے ہو ۔ اُس پر کامل اعتماد ہے ! اس جملہ سے تمہارا کیا مطلب ہے ۔

لطیف ۔ یہ چیز آپکی سمجھ میں نہیں آسکتی ۔ پروین کو ایک شخص سے عشق ہے اور وہ بھی اس پر جان دیتا ہے مجھے معلوم تھا کہ وہ اس نسبت سے انکار کردیگی ۔ میں نے اس انکار کو آسان بنانے کی کوشش کی۔

الطاف ۔ پروین کو کس شخص سے محبت ہے۔

لطیف ۔ یہ میں آپ کو نہیں بتلا سکتا۔

الطاف ۔ تم سے تو نہیں ہے نا ؟ .... اگر یہ واقعہ ہے

لطیف ۔ کیا آپ واقعی سمجھتے ہیں کہ مجھے پروین سے محبت ہے ؟ نہیں مجھے تو خاندان کی عزت اور نیک نامی سے عشق ہے ۔

الطاف ۔ میرے سامنے ایسی جرات پھر کبھی ایسے الفاظ زبان سے نکالو گے ....

لطیف ۔ میں انہیں بار بار دُہرانے کے لئے تیار ہوں ۔ کیا آپ ایسی دو ہستیوں میں خلیج حائل کرنا چاہتے ہیں یا

انہیں ایک دوسرے سے سچی الفت ہے؟

الطاف۔ دنیا کیا کہیگی؟ کیا تمہیں سماج کی انگشت نمائی کا ڈر نہیں؟

لطیف۔ یہ بات نہیں ہے۔ سماج کی تنقید سے ہر شخص گھبراتا ہے لیکن انسانی زندگی کے تباہ کرنے میں مجھے اور بھی ڈر لگتا ہے۔

زمرد۔ کس قدر بیوقوف لونڈا ہے۔ (لطیف سے) خاندان کی عزت اور آبرو پر پانی پھیرنے کیلئے پیدا ہوا ہے۔

لطیف۔ (سنجیدگی سے) نہیں امی۔ گو مجھے اپنی پیدائش کا اصل مقصد معلوم نہیں لیکن اتنا تو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں اس غرض سے نہیں پیدا ہوا۔ میری زندگی کا مقصد.........

زمرد۔ بس، خاموش، تو حد سے بڑھ گیا۔

لطیف۔ امی۔

زمرد۔ چپ رہ۔ نہ تو میرا بیٹا، نہ میں تیری ماں، جا، جو جی میں آئے کر۔

الطاف۔ (زمرد سے) ٹھیرو۔ لطیف نے یہ نہیں کہا کہ وہ پروین سے شادی کرنا چاہتا ہے (لطیف سے) دراصل تمہیں اپنے خاندان کے نام کی اہمیت اور سماج کی تنقید کا کوئی اندازہ نہیں۔ اس لئے تمہاری بے تکی بڑ مجھے خائف نہیں کر سکتی۔ دیکھو لطیف ایسا سپوت میرے کام کا نہیں جو ایک عورت کی خاطر ماں باپ سے بچھڑ جائے۔ اچھا ادھر دیکھو۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ تم نے پروین سے خط و کتابت نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

لطیف۔ ٹھیک ہے۔ اسی وجہ سے تو میں نے اس کو کوئی خطوط نہیں لکھے۔

الطاف۔ کیا تم سچ کہہ رہے ہو۔

لطیف۔ بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ دو تین سال بعد وہ شخص جو پروین کا شوہر ہوگا، میری پارسائی ثابت کردیگا۔

الطاف۔ اچھا تم نے خطوط نہیں لکھے، یہاں تک تو ٹھیک ہے اور اس سے نہ ملنے کا وعدہ بھی تو کیا تھا۔

لطیف۔ اس سے بھی مجھے انکار نہیں۔

الطاف۔ لیکن اس کے باوجود تم اُس کے گھر گئے تھے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے؟

لطیف۔ ہاں۔ میں گیا تھا۔

الطاف۔ آخر کیوں۔

لطیف۔ میں اس کے گھر گیا تھا۔ چونکہ وہ بھی وہیں تھی۔ اس لئے ملاقات ہوگئی۔ لیکن وہاں جانے سے میرا مقصد یہ نہیں تھا۔ میں نے اُس روز امی جان سے جو وعدہ کیا تھا اس پر اب تک قائم ہوں

الطاف۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ پروین کی شادی اس شخص سے ہوجائے تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔

لطیف۔ ابا۔ آپ میری غلطیوں کی سزا پروین کو کیوں دینا چاہتے ہیں؟ میں نے اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کیلئے امی جان سے یہ وعدے کئے تھے۔ کاش میں ایسا نہ کرتا۔

الطاف۔ تو پھر تمہیں اپنی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوجانا چاہئے۔

لطیف۔ بشرطیکہ وہ واجبی ہو۔

الطاف۔ واجبی اور غیر واجبی کا مسئلہ ابھی حل ہوجاتا ہے۔ اچھا تو تم پروین سے ہرگز شادی نہیں کر سکتے۔

لطیف۔ (مسکراتے ہوئے) اگر آپ چاہتے بھی تو میں اس سے شادی نہ کرتا۔ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ پروین کو مجھ سے محبت نہیں۔

زمرد۔ محبت نہیں ہے۔ ہمکو بیوقوف بناتا ہے۔

لطیف۔ امی آپ بڑی وہمی ہیں۔

الطاف۔ کیا تم سچ کہہ رہے ہو کہ وہ تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔

لطیف۔ جی ہاں بارہا کہہ چکا ہوں اور پھر کہتا ہوں یہ واقعہ ہے۔

الطاف۔ یقین سے کہہ رہے ہو

لطیف۔ یقین سے، ایمان سے، ہر چیز سے۔

الطاف۔ (کچھ دیر سوچ کر) دیکھو تم نے ابھی کہا ہے کہ تم اُس سے شادی کرنا نہیں چاہتے۔

لطیف۔ آپ کو میری باتوں پر شبہ کیوں ہو رہا ہے۔

الطاف۔ (بگڑ کر) تمہارا طور ہی بدل گیا ہے۔

لطیف۔ آپ کو یہ خیال کیسے ہوا،

الطاف۔ پہلے تو تم خاص طور سے پروین کے گھر گئے۔ دوسرے اُس کے عاشق کا نام ہم سے چھپایا اور جب میں نے کہا کہ اُس کے ساتھ تمھاری بھی زندگی تلخ ہو جائے گی تو تم نے اُس شروع کر دی۔

لطیف۔ اور تھوڑی سی بکواس سن لیجئے۔ پہلے الزام کا جواب میں آپ کو دے چکا ہوں۔ دوسرے کا جواب یہ ہے کہ میں نے اُس شخص سے راز داری کا وعدہ کیا ہے۔ آخری سوال کا جواب یہ ہے کہ جب تک آپ نے کوئی سوال نہیں کیا میں نے کچھ نہیں کہا۔ البتہ اس کا افسوس ہے کہ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو صورت حال کسی قدر مختلف ہوتی۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں مجھے اس سے تکلیف ہو رہی ہے۔

الطاف۔ کیا تمہیں اب بھی امید ہے کہ ہم پروین سے شادی کی اجازت دینگے۔

لطیف۔ نہیں، مجھے آپ سے ایسی مہربانی کی توقع تو ہرگز نہیں ہو سکتی۔ لیکن جیسا کہ پہلے ہی کہہ چکا ہوں مجھے پروین سے محبت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

زمرد۔ تم ہمیں بیوقوف بنا رہے ہو۔

لطیف۔ معاذ اللہ میں تو صحیح صحیح واقعات سے آپکو آگاہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

زمرد۔ تمہیں ہمارا کچھ بھی لحاظ نہیں۔

لطیف (کبیدہ خاطر ہو کر) میں اب تک سمجھتا تھا کہ ماں باپ کو اولاد سے محبت ہوتی ہے۔

زمرد۔ اور اب کیا سمجھتے ہو۔ دیکھو لطیف کوئی بچہ اپنے ماں باپ سے اس قسم کے جواب سوال نہیں کرتا۔

لطیف۔ ہاں گونگے بچے جواب نہیں دے سکتے لیکن میں تو سوال کا جواب دے رہا ہوں۔

زمرد۔ (الطاف سے) اجی تم اس کا تصفیہ کیوں نہیں کر دیتے میں اسکی حرکتیں برداشت نہیں کر سکتی

لطیف۔ (بے پروائی سے) میں خود بھی تو اماں کی سختیوں سے تنگ آگیا ہوں۔

الطاف۔ تم ہم سے اکثر رہے ہو اور اسے چالاکی سمجھتے ہو۔ ہمارے احسانات کو بالکل بھلا دیا۔

لطیف۔ میں دیکھتا ہوں کہ والدین اپنی اولاد کی پرورش اور تربیت کرتے ہیں، لیکن اسکے ساتھ اس قسم کا سلوک کرتے ہیں کہ بچہ ہوش سنبھالتا ہے تو اُن سے متنفر ہو جاتا ہے، بلکہ اُن سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔ یہی حال میرا بھی ہے آپ مجھ پر خواہ مخواہ عنایت کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ چیز کارگر نہ ہوگی۔

الطاف۔ عجیب قسم کا بچہ ہے۔

لطیف۔ آپ لوگ اپنے الفاظ کی اہمیت سے واقف نہیں۔ آپ کو نوجوانوں کے جذبات کا اندازہ نہیں ہے۔ یہ زمانہ آپکی جوانی کے زمانہ سے جداگانہ ہے۔ اسکے علاوہ چھوٹا درخت بڑے درخت کے سایہ میں رہنا نہیں چاہتا۔ اُسے دھوپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ہوا کے جھونکوں کا مقابلہ چاہتا ہے۔ بوڑھے لوگ دنیا کو غم اور رنج کا گھر سمجھتے ہیں لیکن نوجوان اُسے دارمسرت خیال کرتے ہیں۔ اپنی زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہونا اور مسرت حاصل کرنا، کیا زندگی کا اس سے بہتر بھی کوئی مقصد ہوسکتا ہے۔

الطاف۔ لیکن، لطیف تمہیں اس قدر خود غرض نہ ہوجانا چاہئیے۔

لطیف۔ میں ہرگز خود غرض نہیں ہوں۔ اپنی مرضی سے ہر قسم کی قربانی کرنے پر آمادہ ہوں لیکن دوسروں کے کہنے سے مجبور ہو کر کوئی کام نہیں کرسکتا۔ اگر میں وہ شخص ہوتا، جسکا شبہ آپ کو میرے متعلق ہوگیا ہے، تو اپنے مقصد کے حصول میں مجھے جو جو دقتیں پیش آئیں انکی مطلق پروا نہ کرتا اور خاندانی عزت، آبرو اور ہر قسم کے استحقاق کو خیرباد کہ دیتا۔

زمرد۔ تم نے یہ کہنے کی کیسے جرات کی۔

الطاف۔ (زمرد سے) ٹھیرو۔ لطیف نہیں جانتا کہ وہ کیا کہ رہا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ صرف یہ ظاہر

کرنا چاہتا ہے کہ اُسے پردیں سے کوئی لگاؤ نہیں (لطیف سے) تم جا سکتے ہو مجھے اور کچھ کہنا نہیں ہے۔

زمرد ۔کیا تمہیں بھی اُسکی باتوں پر یقین آگیا؟

(لطیف سر جھکا کر رونا شروع کرتا ہے)

ہیں لطیف، خیر ہے طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟

لطیف ۔آپ کی بلا سے۔میری طبیعت سے آپکو کیا غرض۔ گھبرائیے مت دوا کا خرچ زیادہ نہ ہوگا۔

الطاف ۔لطیف کوئی بات ضرور ہے۔ تمہاری صحت بھی خراب ہوتی جارہی ہے۔تم پردیں کے لئے اپنی جان دے دوگے۔ میں تمہیں اس سے پہلے کبھی اس طرح روتے نہیں دیکھا۔

لطیف ۔ روتے میں بات ہی کونسی ہے۔آپ جانتے ہیں کہ رونا بہ نسبت کوشش کرنے کے آسان ہے لیکن اب اجازت دیجئے مجھے تنہائی کی ضرورت ہے۔

(تھوڑی دیر ساکت رہنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

مجھے آرام لینے کی ضرورت ہے۔

باہر جاتا ہے۔ الطاف اور زمرد دونوں اسکی طرف خاموشی سے دیکھتے رہتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد)

زمرد ۔ یا اللہ یہ کیا آفت ہے۔اب کیا کرنا چاہیئے۔

الطاف ۔خیر۔لطیف اپنا چھوٹا لڑکا۔شادی کی اجازت دے بھی دینگے۔اب اسکے سوا کوئی چارا نہیں

تھوڑی دیر تک سکوت رہتا ہے، سعیدہ داخل ہوتی ہے۔

کیا ہے سعیدہ

سعیدہ ۔جی کچھ نہیں لطیف

الطاف ۔کیا وہ باہر چلا گیا۔

سعیدہ ۔نہیں۔ اپنے کمرے کے سامنے ٹہل رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے۔جواب ندارد۔ پھر پوچھا تو میری طرف گھور کر خاموش ہوگئے۔ میں جانتی تھی کہ وہ دیر تک یہاں آپ سے باتیں

کر رہے تھے۔ اس لئے دریافت کرنے چلی آئی۔

زمرد۔ (سعیدہ سے) اچھا یہ تو بتلاؤ کہ شمیم کے پاس سے آج بھی کوئی خط آیا یا نہیں۔

سعیدہ۔ جی نہیں، بہت روز سے کوئی خط نہیں آیا۔

زمرد۔ اُسے ہماری پروا نہیں لیکن وہ جانتا ہے کہ ہمیں اسکی کسی قدر فکر ہے، اس لئے اب تک کوئی نہ کوئی خط آنا چاہیئے تھا

الطاف۔ ممکن ہے وہ کسی اہم کام میں مشغول ہو۔

زمرد۔ (   ) دو مہینہ سے خیریت کی اطلاع بھی نہیں ملی۔ میری امیدیں تو شمیم سے وابستہ ہیں

سعیدہ۔ امی جان، لطیف بھائی نے کیا کہا

زمرد۔ کچھ نہیں، کیوں، کیا تم اس میں کوئی تبدیلی پاتی ہو۔

سعیدہ۔ نہیں، مجھے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی۔ بعض اوقات تو مجھ سے اچھی طرح ملتے ہیں، لیکن جب کبھی سوچ میں ہوتے ہیں تو میری باتوں کا کوئی جواب نہیں دیتے۔ کچھ پوچھتی ہوں تو میری طرف گھور کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

زمرد۔ عجیب لڑکا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسکو کیا ہو گیا ہے۔

اس گفتگو کے دوران میں الطاف کچھ سوچ رہا تھا اب وہ چونک کر زمرد سے کہتا ہے

الطاف۔ مجھے ایک نہایت خوفناک خیال پیدا ہو گیا ہے۔

زمرد۔ وہ کیا

الطاف۔ ممکن ہے وہ شخص شمیم ہو۔

زمرد۔ (پریشان ہو کر) اوہ۔ یہ واقعہ ہو تو بڑی مصیبت ہے۔

الطاف۔ ہاں، ہم اس سے بری بلا میں پھنس جائیں گے۔

(سعیدہ سے) بیٹا تم یہاں سے چلی جاؤ۔

(سعیدہ چلی جاتی ہے)

میں سمجھتا ہوں، یہی بات ہے۔

زمرد۔ ہرگز نہیں۔

الطاف۔ ممکن ہے تمھارا خیال صحیح ہو، لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو لطیف اس قدر بہکی بہکی باتیں کیوں کرتا۔ شمیم نے تقریباً اس روز سے خط نہیں بھیجا جبکہ ہم نے پروین کے گھر واپس جانے سے متعلق لکھا۔ اس سے پہلے ہفتہ میں دو خط ضرور آتے تھے خطوط کی بھرمار کی وجہ میری سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ دونوں میں خوب گھٹتی ہے۔ لیکن اب میں تمام باتیں سمجھ چکا ہوں۔ لطیف نے پروین سے خط و کتابت کرنے کی قسم کھائی۔ شادی کرنے کا بھی کئی دفعہ وعدہ کیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اسکا کہنا جھوٹ ہے۔

زمرد۔ اف، اگر یہ واقعہ ہے تو............

الطاف۔ یہ ایک معمہ ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ لطیف کی عجیب عجیب باتوں اور کاموں کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ مجھے وہ الفاظ بھی یاد ہیں جو شمیم نے جاتے وقت کہے تھے۔

زمرد۔ اگر وہ صحیح ہیں تو کیا ہوگا۔

الطاف۔ ہماری قسمت۔

زمرد۔ پروین کی شادی کسی اور سے کر دیجائے تو شمیم کیا کرے گا۔

الطاف۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسے سخت صدمہ ہوگا۔ اور.......

زمرد۔ کیا اس صدمہ سے اسکی صحت پر اثر پڑیگا۔

الطاف۔ اس کا اندیشہ نہیں۔

زمرد۔ لیکن ان دونوں کو ہم سے نفرت ضرور ہو جائے گی۔

الطاف۔ واقعہ ہے۔ دونوں ہم سے اور گھر سے بیزار ہو جائیں گے۔

زمرد۔ ہاں، لیکن اگر پردیسی سے شادی کرنے کی اجازت دیجائے تو خاندان کی آبرو خاک میں ملجائیگی۔

الطاف۔ بالکل سچ کہتی ہو۔ لوگ انگشت نمائی کرینگے۔

وہ دروازہ کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ گفتگو کرتا ہے

لطیف ہماری گفتگو سن رہا ہوگا۔ وہ بھروسے کے قابل نہیں ہے۔

لطیف۔ (باہر سے) بیشک وہ قابل اعتماد نہیں۔

(دروازہ کھولکر داخل ہوتا ہے)

یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اسکی اطلاع مجھے سعیدہ نے دی ہے۔ اس لئے دروازہ کے پاس ٹھہر کر میں نے تمام باتیں سن لیں۔

دونوں خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔

لطیف۔ بھائی جان سے متعلق آپ کا قیاس بالکل صحیح ہے لیکن آپنے انکی محبت سے متعلق غلط رائے قائم کی ہے وہ دونوں ایک دوسرے پر جان دیتے ہیں۔

الطاف۔ خیر اس کا ذکر چھوڑو۔ میں ابھی شمیم کو لکھتا ہوں کہ ہمیں تمام امور کا علم ہوگیا۔ ہم اس چیز کو برداشت نہیں کر سکتے۔

لطیف۔ اگر آپ نے لکھا تو میں یہ لکھ بھیجتا ہوں کہ "امی جان اور ابا اس نسبت سے خوش ہیں اور تمام امور کا تصفیہ آپکی توقعات سے بھی زیادہ آسانی سے طے پا چکا ہے۔ قسم ہے میں یہی لکھوں گا۔ یہ راز میری غفلت سے افشا ہوا ہے۔ اس لئے میں انکے حل کا ذمہ دار ہوں۔ دونوں کو مجھ پر بھروسہ تھا، اور میں بھی اپنے آپ کو اعتماد کے قابل سمجھتا تھا۔ لیکن.........

الطاف۔ ایسی جرات کی تو میں تمہیں گھر سے نکال دوں گا۔

لطیف۔ میں سب کچھ سہنے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کیلئے تیار ہوں۔ مجھے پہلے ہی سے اسکا یقین تھا خیر کسی طرح گزار لوں گا۔

(سب کے سب تھوڑی دیر خاموش رہتے ہیں اسکے بعد)

زمرد ۔ عجیب لڑکا ہے

الطاف ۔ سپوت ہے سپوت ۔

لطیف ۔ میں موت سے بھی نہیں ڈرتا ۔

(وہ رونے لگتا ہے)

الطاف ۔ تجھے تیری حرکتوں کی سزا دینی چاہتا ہوں لیکن دل نہیں مانتا ۔ بچہ ماں باپ کو چھوڑ سکتا ہے لیکن ماں باپ اسکو نہیں چھوڑ سکتے ۔

زمرد ۔ سعیدہ تو ہے، وہ ہمارے ساتھ رہے گی ۔

سعیدہ ۔ (باہر سے) امی جان

(داخل ہوکر)

میں بھی لطیف بھائی کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی ۔

زمرد ۔ عجیب بچے ہیں ۔

الطاف ۔ اب تو میں بالکل بے بس ہوگیا ہوں ۔ لطیف میں تمہاری تمام باتیں ماننے کے لئے تیار ہوں، تم شمیم کو جو چاہو لکھو ۔ دنیا کچھ بھی سمجھے ۔ لیکن میں تمہیں ہاتھ سے نہیں دے سکتا ۔

لطیف ۔ شکریہ ابا جان ۔ شمیم بھائی کی زندگی پروین کے ساتھ بہت اچھی طرح بسر ہوگی ۔

(زمرد سے مخاطب ہوکر)

امی جان، آپ فکر نہ کریں ۔ اگر ہم سماج کی نظروں میں نہ جنچیں تو کوئی بات نہیں ۔ ہماری زندگی تو خوشی اور اطمینان کے ساتھ بسر ہوگی ۔ میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے لللہ اسے معاف کردیجئے ۔

الطاف ۔ لطیف تم کس سوچ میں ہو؟ ۔

لطیف۔ کچھ نہیں۔

وہ چلا جاتا ہے۔

الطاف۔ فکر مند کیوں ہو۔ تینوں بچے ہم سے خوش ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی اختلاف باقی نہیں رہا لطیف کا خط دو ہی روز میں پہونچ جائے گا۔ پروین کو آج ہی واپس بلالینا چاہیئے۔

زمرد سر اٹھا کر الطاف کی طرف دیکھتی ہے

دونوں مسکرا دیتے ہیں۔

پردہ



صدائے سروش

از مولوی نور اللہ محمد صاحب نوری

بلند میکدہ میں ہے صدائے نائے و نوش
ہے کوئی بے خود و سرشار اور کوئی مدہوش

جو شیخ جی کو تھا پرہیز جام مینا سے
نگاہ مست نے ساقی کے کر دیا بے ہوش

لگا دی اس طرح سے مے کی چاٹ ساقی نے
کہ ایک صف میں ہیں شاہ و گدا ابھی دوش بدوش

پلائے وہ مئے دیرینہ اے مرے ساقی
فسردہ طبع میں پیدا ہو جس سے جوش و خروش

کبھی تو سر سے ٹلیگی مصیبت ہجراں
کبھی تو ہم سے وہ بیدرد ہو گا ہم آغوش

امید عفو پہ لغزش ہوئی ہے عاصی سے
عطا بپاش و خطائے گناہگار بپوش

وہ کون ہے جو تمہارا نہیں ہے دلدادہ
وہ کون ہے جو تمہارا نہیں ہے حلقہ بگوش

یہی ہے اصل میں کیا رمز نحن و اقرب کا
قریب رگ کے بھی ہم سے وہ رہتے ہیں روپوش

خدا کے واسطے تاخیر اب نہ کر ساقی
غزل یہ حضرت نوری کی ہے صدائے سروش

صلائے عام

(ایک سین)

از

مولوی مرزا محی الدین بیگ صاحب بی۔ اے۔ سی ٹی۔

سہ پہر۔ نعیمہ کا ملاقاتی کمرہ۔ دائیں جانب میز پر گھومنے والی بک شلف، بائیں جانب میز پر ہینڈ بیگ سٹے تہس۔ کوپ، کتابیں، کاغذات، نکل پلیٹیڈ ڈبے وغیرہ۔ بیچ میں سوفہ جس کے دونوں جانب گدے دار کرسیاں ہیں۔ سامنے ٹی ویگن ہے اور پیسٹری اسٹینڈ۔ نعیمہ کرسی پر بیٹھی ہے۔ صالحہ کو جو سوفے پر بیٹھی ہے۔ چا کی پیالی بنا کر دیتے ہوئے پیسٹری کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ صالحہ کسی سوچ میں بیٹھی ہے

نعیمہ۔ اے، ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر۔ پیسٹری لو۔ (اپنی چاء بناتی ہے۔)

صالحہ۔ اے۔ لو، میں اور تمہارے ساتھ تکلف برتوں۔ خوب (ہاتھ میں پیالی لیئے ہوئے سوچ میں پڑ جاتی ہے۔

نعیمہ۔ صالحہ تمہیں ہوا کیا ہے۔ خیریت تو ہے۔ چپ چپ کیوں ہو، کچھ تو منہ سے بولو سر سے کھلو، آخر ہو کس سوچ میں۔

صالحہ۔ ابھی آپ نے کہا تھا کہ شادی بڑوں سے ہوتی آئی ہے۔ اسی لیے آپ کو بھی مفر نہیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ آخر آپ کو کس مبارک گھڑی کا انتظار ہے۔

نعیمہ۔ شادی۔ شادی۔ شادی نہ ہوئی وبال جان ہوگئی۔ شادی میری ہوئی ہے فکر آپ کو کھائے جا رہا ہے۔ لڑکی ہوش کے ناخن لے، شادی کیا ہوگئی کہ آپ بڑی بن گئیں۔

صالحہ۔ لو بوا۔ میں بڑا پا کیوں جتانے لگی۔ ماشاء اللہ سے تم میری ہر طرح سے عمر میں، تعلیم میں، بزرگ ہو میں تو صرف یہ کہتی ہوں کہ جب کرنی ہے تو نیک کام میں دیر کیوں۔

نعیمہ۔ پھر وہی رٹ۔ یہ بھی کچھ خیر ہے کہ آج کل کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کی شادی بیاہ کے بارے میں کیا رائے ہے۔

صالحہ۔ جی ہاں۔ گویا یہ بھی کوئی پہیلی ہے۔

نعیمہ۔ نہیں دنیا کی کچھ خبر ہی نہیں۔ ورنہ یقین ہوتا کہ یہ بڑی کٹھن پہیلی ہے۔ تم جسے شادی سمجھتی ہو وہ تو زمانہ جاہلیت کی یادگار متصور ہوتی ہے۔ اب وہ شادی شادی نہیں جو رومانیت کا نتیجہ نہ ہو۔

صالحہ۔ تو بوا وہ رومانیت کیا ہوتی ہے۔

نعیمہ۔ دلگی جس میں جان جوکھوں میں پڑے۔ بازی جس میں آبرو کا امتحان ہو۔ ہنسی جسکی آواز دبی ہوئی کھلا راز جو دلچسپ و دلگداز ہو۔ دنیائے عشق جو بزرگانہ مشورت سے دور ہو۔ وہ فعل جسے تعلیم یافتہ مذاق کہیں اور جاہل بے آبروئی۔

صالحہ۔ آخر پہیلی بنا ہی دیا۔ اب بوجھے بھی آپ۔

نعیمہ۔ سنو آج کل کی اکثر علم دوست خواتین چاہتی ہیں کہ کوئی ٹیڑھا بانکا عاشق ہو اس سے ملاقات ہو جائے مگر اتفاقیہ راہ و رسم لطیف پیرائے میں بڑھے اور رفتہ رفتہ جذبات عقیقت اور واردات قلب کا انکشاف ہو۔ پینگ بڑھے لیکن آرزو شرمندۂ اظہار نہ ہو۔ پھر کسی سہانے وقت میں اکیلے ہوں تو البتہ شاعری کی اجازت ہے۔ جواب انکاری ملے گا لیکن اوس میں بددل یا ناامید ہونے کی

ضرورت نہیں۔ ٹھیک ہوجائیں گے دوچار ملاقاتوں میں۔ پھر رقیبوں کے جوڑ توڑ اور عزیزوں کی رخنہ اندازیاں ہیں۔ بالآخر وہی جسکی لاٹھی اوسکی بھینس۔ راتوں رات چھپ چھپاکر بھاگنا تو بس ایک کھیل ہے۔ لو مبارک ہو رشتہ زن وشو جوڑ دیا گیا، شادی ہوگئی۔

صالحہ۔ توبہ ہے۔ ایسوں پر خدا کی سنوار۔ ان نگوڑیوں کے دیدے تو دیکھو۔ شرم وحیا کا ذرا پاس و لحاظ نہیں شرافت کا دھیان نہیں۔ ان خیالات سے گھن آتی ہے حرکات سے جی تھرا اٹھتا ہے۔

نعیمہ۔ خوب اپنی پہلی چلائی۔ ذرا کوئی ان کے دلوں سے پوچھے کہ اس تیز روی میں کتنا لطف ہے۔ تم نے اتنا لکھا پڑھا ہی نہیں کہ اسکی لطافت کا اندازہ کرسکو۔

صالحہ۔ بوا ایسے لکھنے پڑھنے کو دور ہی سے سلام، بندی جاہل ہی بھلی۔

نعیمہ۔ تم سے امید بھی یہی ہے۔

صالحہ۔ اچھا وہ اصلی بات تو اڑا گئیں۔

نعیمہ۔ تمہیں معلوم ہوگیا کہ تعلیم یافتہ اور علم دوست خواتین نے شادی بیاہ کی کیا جدید رسمیں قائم کر رکھی ہیں۔ اب میں بھی آخر تعلیم یافتہ اور علم دوست ہوں چٹ منگنی پٹ بیاہ کیسے ہوجائے۔

صالحہ۔ اے بوا، نوج ہو۔ ان سٹھیاہی علم دوست عورتوں پر خدا کی مار شریفوں کو تو یہ رنگ ڈھنگ ہرگز نہیں بھاتے۔ خدانخواستہ تم ان نگوڑی ماریوں میں کیوں ملنے لگیں۔ میں جانتی ہوں۔ یہ رذالا خبط تم پر سوار نہیں۔ مجھے ستانے کی ترکیب نکالی ہے۔ ایسی بھی میں کیا الّو ہوں کہ چھوٹی سے بڑی ہوئی اور اتنا نہ پہچانوں۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شادی کے سندر نام کا مذاق اڑانے پر تمہاری چھاتی کیوں کر ٹھکتی ہے۔

نعیمہ۔ (شانے اٹھاکر مسکراتے ہوئے) مذاق نہ کروں تو آخر کروں کیا۔

صالحہ۔ شادی کرلو۔

نعیمہ۔ بہت خوب، اکسیر اعظم کا کیا خوب نسخہ تجویز کیا ہے گویا صرف شادی پر ہی تو ساری دنیا کے

کاروبار اور مسرتوں کا انحصار ہے۔ یہ بھی کوئی کیلی ہے جس کے بغیر چکی چل ہی نہ سکے۔ میں علم دوست خواتین کے جدید رسوم کی پابند نہیں ہوں تو شادی کو میٹھا میٹھا ہپ ہپ بھی تصور نہیں کرتی کہ کوئی غٹ غٹ نگل جائے۔ بہن، یہ وہ چٹان ہے جس پر بہتیرے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکے ہیں۔ دنیا تمہارے لئے پردہ کی آڑ میں ہے۔ تمہیں کیا خبر ادھر کیا خرابہ ہو رہا ہے۔ ماں باپ نے شادی کر دی۔ تم خوش ہو گئیں۔ تمہیں قسمت کے دھنی، مرضی کے موافق میاں مل گئے۔ بس سمجھنے لگیں کہ سب مرد آپکے میاں کی طرح شریف اور سمجھدار ہوتے ہیں اور لگیں شادی کی رٹ لگانے۔ یہ تو وہی ہوا، گئے چمگادڑ سے ملنے، وہ اندھی لٹکی ہوئی تھی لگی کہنے آ بہن تو بھی لٹک جا۔

صالحہ۔ اے لو۔ بوا تم تو مجھ پر ہی برس پڑیں۔ سب کچھ سہی مگر مطلب پر بھی آؤ گی یا یونہی ٹالے مٹولے کئے جاؤ گی۔ میں پوچھتی ہوں آخر گن سن بھی ہے۔

نعیمہ۔ یہ بھی ایک ہی رہی۔ اکی پردہ سے باہر مردوں میں اٹھنے بیٹھنے والیوں کو کیا کمی۔ مجھے تم سے چھپانے کی ضرورت نہیں۔ بہتروں نے نئے نئے مضحکہ خیز جال بچھائے۔ طرح طرح سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی مگر خدا کا شکر ہے مغربی تہذیب سے میں مرغوب نہیں کہ وہ مجھے لئے اڑیں میں سمجھتی تھی وہ میرے گون کے نہیں وہ وہ ٹکڑا توڑ جواب دیئے ہیں کہ عمر بھر یاد ہی کریں گے۔ آج کل ہمارے ہاں اینڈتے پھرنے کی ایسی وبا پھیلی ہے کہ ہر نوجوان جدید ماحول میں مسرت اور زینت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ محنت و مشقت سے دور بھاگتا ہے اور مجھے ایسی بیکار زندگی سے سخت نفرت ہے۔ وہ انسان ہی کیا جو کوئی کارآمد کام نہ کر سکے یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ میاں بیوی کولہے سے کولہا ملائے للّو، پتّو کرتے اینڈھتے پڑے ہیں۔ بیوی میں تم پر قربان، میاں میں تم پر واری جاؤں کا ورد ہو رہا ہے اور دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں آخر یہ سلسلہ کب تک چلیگا۔ دو چار مہینے۔ بہت ہو تو سال بھر۔ پھر بقول کسی کے ان تلوں تیل ہی نہیں،

صالحہ۔ تو بوا تم چاہتی کیا ہو۔ میاں بیوی اپنے اپنے کاموں میں ایسے جتے رہیں کہ ایک دوسرے کی

عورت بھی نہ دیکھنے پائیں۔

نعیمہ۔ نہیں ہر کام کا وقت ہوا کرتا ہے۔ سود مند کام کرنا خواہ مرد ہو یا عورت اس پر لازم ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے۔ کام بھی ہو اور محبت بھی، لیکن اپنے اپنے وقت پر۔ ورنہ شادی وہی ہو جائیگی، سانپ کے منہ میں چھچھوندر، نگلے تو اندھا اگلے تو کوڑی۔

صالحہ۔ یہ تو بوا تم سچ کہتی ہو۔ ہمارے پڑوس میں تین چار مہینے پہلے شادی ہوئی۔ میاں بیوی ایسے گھلے ملے کہ لوگوں کو دیکھکر رشک آتا تھا۔ بیوی آنکھ سے اوجھل ہو جائیں تو میاں کی چھاتی پر سانپ لوٹنے لگتا تھا۔ مگر اب تو اوس مردوے نے ایسی سانپ کی سی کچلی جھاڑی ہے کہ بس توبہ ہی بھلی۔

نعیمہ۔ ہر شے کی زیادتی نقصان دہ ہوتی ہے۔ اور بیکار آدمی کب تک کسی ایک بات پر جم سکتا ہے یہ نام نہاد محبت بھی زندگی بھر کام نہیں دیتی چند دن کے بعد طبیعت کا ایک دوسرے سے اکتا جانا۔ زندگی اجیرن معلوم ہونے لگتا تعجب کی بات نہیں۔ کام ہی ایک ایسی قابل قدر شے ہے جو انسان کو افراط کے خمیازہ سے بچا سکتی ہے۔ تمہاری پڑوسن کی زندگی سے تو یہی اچھا کہ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے۔ تو بہن جب تک مجھے کوئی سمجھدار محنتی نہ ملیگا۔ میں تو جان بوجھ کر اس شادی کے جنجال میں نہ پھنسونگی۔ اس سے تو بندی لنڈوری ہی بھلی۔

صالحہ۔ برا نہ مانو تو ایک بات سچی سچی کہوں۔ تمہیں تو کام کا خبط سا ہو گیا ہے۔ بچپن سے تمہارا یہی وطیرہ ہے مدرسے کے زمانے میں ہی بڑی بڑی اونچی باتوں پر دھیان بندھا رہتا تھا۔ کسی محنت سے جی چرانا جانتی نہ تھیں۔ سارا خاندان ایک طرف اور تم ایک طرف کہ پڑھونگی اور ڈاکٹری پڑھونگی اور وہی کیا جو کہتی تھیں۔ ولایت بھی ہو آئیں۔ لیکن کام کا چسکا نہ گیا۔ اب بھی سر سے کنواں کھودنے تیار ہو جاتی دینا ہے آخر یہ سر پھری باتیں کب تک۔

نعیمہ۔ جب تک سر میں بال ہیں اور دم میں دم بندی تو نکمٹو سے سر پھوڑنے سے رہی

صالحہ۔ اپنی ڈیڑھ انیٹ کی مسجد الگ ہی چنو گی۔ کچھ خالہ جان کا بھی خیال ہے۔ تم کو پالا پوسا بڑا کیا۔ سب سے بُری ہوئیں تمہاری مرضی کی تعلیم دلائی۔ اب خدا خدا کرکے تم فارغ ہوئیں ہو۔ نوکر بھی ہو چکیں انہوں نے سب کچھ تم پر چھوڑ رکھا ہے۔ بس ایک تمہاری خانہ آبادی دیکھنے کو ترس رہی ہیں۔ جب کبھی ذکر آجاتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔ مگر صبر کی بندی اف تک زبان سے نہیں نکالیں، اب انکا لے دیکر سوائے تمہارے کون رہ گیا ہے اور تم ہو کہ ذرا انکی خوشی کا خیال تک نہیں کرتیں۔

نعیمہ۔ دیکھو صالحہ یہ سراسر اتہام ہے۔ میں ایسی احسان فراموش نہیں کہ مجھے ان کے حسین خیالات وجذبات کا احساس نہ ہو۔ مجھے یقین ہے اگر وہ اور خدا بخشے باوا جان میری خواہشات کی پرواہ نہ کرتے اور دنیا کی انگشت نمائی سے ڈر جاتے تو آج میں بھی بہت سی لڑکیوں کی طرح ناکارہ مرد و نکمے نکما نہ اشاروں پر بندر کی طرح ناچتی اور بچوں کا شیطانی لشکر میرے پیچھے ہوتا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ان دونوں نیکی کے فرشتوں نے میری خوشی کے لئے خاندان بھر کے طعن و تشنیع کا سامنا کیا۔ مگر میرا دل نہ توڑا۔

صالحہ۔ تمہارا ساتھ نہ دیتے تو کرتے کیا۔ پڑھائی لکھائی سے چوکنے والی تھیں۔ تم جیسی ضدی ......

نعیمہ۔ خیر اسے جانے دو۔ اب بھی امی جان نے سب کچھ مجھ پر چھوڑ رکھا ہے تو کیا مجھ پر یہ فرض نہیں کہ انکی بات کی لاج رکھنے کیلئے دنیا کے سامنے کامیاب بن کر رہوں تاکہ بہتان اڑانے والے دیکھیں خاندانی لڑکیاں تعلیم سے کیا فائدہ اٹھاتی ہیں اور انکی زندگی کس طرح دنیا کے لئے شمع ہدایت بن سکتی ہے۔ شادی کے سبز باغ دیکھنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ اپنے حقیقی خیالات کے بہاؤ کے مطابق تصفیہ کیا جائے اور گھٹیا جذبات اور بے حقیقت مشکلات سے خود کو پست نہ ہونے دیئے۔ بر کا انتخاب قرعہ اندازی نہیں۔ میں کہہ چکی ہوں کہ جب تک کوئی میری گون کا نہ ملیگا۔ میں ہرگز ہرگز خود کو دھوکہ دے کر اندھے گڑھے میں نہ گرونگی۔ اور یقین جانو امی جان بھی یہ کبھی گوارا نہ کرینگی کہ میں خود کو یوں تباہ کرلوں۔ کیونکہ میری کامیابی دراصل انکی کامیابی ہے۔

صالحہ۔ جی ہاں۔ آپ ایسے مرد سے شادی کرینگی جو آپ کو چاہئے آپکی طرح محنت و مشقت کرے، عیدی، مسند کا گدھا نہ ہو۔ شکل پسند ہو۔ شخیت معاب نہ ہوا ور پھر آپ اوس سے محبت کرتی ہوں مگر یہ تو بتائے آپ کی یہ نادر ہستی پیدا بھی ہوئی ہے۔

نعیمہ۔ اچھی کہی۔ یہ میں کیسے جانوں۔ میں نے علم غیب تو حاصل کیا نہیں۔

صالحہ۔ آخر کچھ تو معلوم ہو۔

نعیمہ۔ مجھے معلوم ہوگا تو تمہیں بھی بتا دونگی۔ تم تو میرا دماغ چاٹ گئیں للہ کچھ اور ذکر چھیڑ دو۔

(پردہ)

غزل

از نواب نظام الدینخاں بہادر صابرؔ

تھا عجب عالم جو پنہاں جلوۂ جانانہ تھا
اپنا بھی اپنا نہ تھا بیگانہ تو بیگانہ تھا

ہو کے دیوانہ ترا سمجھا میں یہ راز نہاں
جو تری الفت سے تھا نا آشنا دیوانہ تھا

عرض کرتا کیا میں ساقی سے شکستِ دل کا حال
سامنے بس رکھ دیا ٹوٹا جو اک پیمانہ تھا

میکشوں کا ذکر کیا، شیشے بھی ساقی بزم میں
ہچکیاں لے لے کے روئے، وہ مرا افسانہ تھا

غیر کے حصے میں سب کچھ تھا، مگر پیماں شکن
پھوٹی قسمت میں مری ٹوٹا ہوا پیمانہ تھا

تفرقہ ممکن نہیں اے یار حسن و عشق میں
تو جہاں تھا شمع محفل میں وہیں پروانہ تھا

بزم میں بیکار تھے سب شیشۂ و جام سبو
جس کو دیکھا تیری چشم مست کا دیوانہ تھا

میں کہاں اور امتحانِ الفتِ قاتل کہاں
سچ تو یہ ہے تیرا احساں ہمت مردانہ تھا

وہ بھی کیا دن تھے کہ میں تھا اور بزم عیش صابرؔ
چشم ساقی پر نظر تھی ہاتھ میں پیمانہ تھا

کیس نمبر ۳ میمو نمبر ۱۷

مولوی سید انصار احمد صاحب

.... ہاں کوپر روڈ مکان ۶۳ میں ..... جی ..... میرا نام ؟ جعفری ..... علی ناصر جعفری .....
ہاں میں اسی مکان میں رہتا ہوں ۔ کیا ۔ جی ہاں ظاہراً خودکشی ہی معلوم ہوتی ہے ..... اچھا میں آپ کا انتظار
کرتا ہوں ، نہیں کوئی چیز جگہ سے ہٹائی نہیں گئی ۔ کمرہ مقفل کر دیا گیا ہے ۔

جعفری پبلک ٹیلیفون سے یہ اطلاع پولیس ہیڈ کوارٹر کو دینے کے بعد مکان میں واپس آیا اور مقفل کمرے کے سامنے پولیس انسپکٹر کے انتظار میں ٹہلنے لگا ۔ اس مکان کا مالک ایک معمولی شخص یعقوب تھا ۔ سگریٹ ، دیا سلائی کے بیوپار سے جو کچھ آمدنی ہوتی وہ اس قدر کافی تھی کہ اپنی بیوی اور ایک لڑکی کے ساتھ خوش حالی کی زندگی بسر کر سکتا ۔ لیکن گھوڑ دوڑ کی لت نے اس کو تباہ کر دیا تھا ۔ بیوی سے ہمیشہ برتاؤ خراب رہا ۔ کبھی کبھی کچھ روپئے اسکو دیدیتا جس سے وہ تمام گھر کے اخراجات چلاتی ۔ البتہ ایک مستقل ذریعہ آمدنی مکان کے بالائی حصہ کا کرایہ تھا ۔ جس میں مسٹر جعفری وکیل رہا کرتے تھے ۔ مکان کا کرایہ پہلے یعقوب خود لے لیا کرتا تھا ۔ لیکن جب وکیل صاحب نے دیکھا کہ بعض وقت اوسکی بیوی اور لڑکی پر فاقہ کشی کی نوبت گذری تو انہوں نے ازراہ ہمدردی ایک روز

یعقوب کو خوب سا کچھ پلا یا اور اس امر پر آمادہ کیا کہ کم از کم زر کرایہ میں اُس کا کوئی دخل نہو۔ اور وہ ماہ بماہ اکی بیوی ہی کو ادا کر دیا جائے۔ اس ہمدردی نے وکیل صاحب کا احترام بیوی کے دل میں کافی پیدا کر دیا تھا اور یعقوب سے بھی چونکہ وکیل صاحب کا برتاؤ اچھا تھا اسلئے وہ بھی انکو عزت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ بیوی سے جس دن زیادہ لڑائی جھگڑا ہوتا۔ یعقوب علیحدہ اپنے ایک خاص کمرے میں سویا کرتا جو مکان کے مغربی جانب تھا۔ اور جس میں وہ تمام ضروریات کی چیزیں مقفل رکھتا تھا۔ ایک دوسرا برآمدہ شمال کی جانب تھا جس سے ملحق ایک اور کمرہ تھا۔ اس میں یعقوب کی بیوی مع اپنی لڑکی کے رہا کرتی تھی۔ اوس کے سامنے صحن جو زیادہ وسیع نہ تھا اور صحن کے جنوب میں ایک اور برآمدہ تھا جو باورچی خانہ کا کام دیتا تھا۔ مشرق میں پرانی وضع کی ایک محراب تھی جس میں پھاٹک لگا تھا۔ اور اوس کے دونو جانب بیت الخلا اور حمام تھے۔ اوپری منزل میں وکیل صاحب رہتے تھے جس کا زینہ پھاٹک کے اندر سے تھا۔ مکان میں سب سے آخری شخص جو داخل ہوتا وہ یعقوب تھا۔ اس لئے پھاٹک میں قفل ڈالنا اوسی کے سپرد تھا۔ وہ صبح ٹھیک چار بجے اٹھنے کا عادی تھا۔ ....

....

.... اور اوسی وقت پھاٹک بھی کھولدیتا۔

جعفری جس کے چہرہ سے کچھ بے چینی ٹپکتی تھی ٹہلنے میں مصروف تھا۔ ماں بیٹی دونوں مقفل کمرے کے دروازہ کو پکڑے زار زار رو رہی تھیں۔ جعفری سمجھانے کی کوشش کرتا لیکن یہ موقع نہ تھا کہ کوئی تقریر کارگر ہوتی۔ تھوڑی دیر بعد انسپکٹر مراد علی مع ایک سب انسپکٹر و چند کانسٹبلوں کے پہونچ گئے۔ مجھکو فوراً موقع پر لے چلئے مراد علی نے کہا۔

جی ہاں یہی کمرہ ہے جس میں قفل پڑا ہوا ہے۔ جعفری نے اشارہ سے بتلایا۔

مراد علی۔ اس میں یہ قفل کس نے ڈالا؟

جعفری۔ میں نے۔

مراد علی۔ تو کیا دروازہ کھلا ہوا تھا؟ جی نہیں کھولا گیا ہے۔ جعفری نے بتایا۔

مراد علی۔ ذرا ٹہرئیے (جیب سے ڈائری نکال کر) کس نے کھولا؟

جعفری۔ میں نے۔

مراد علی۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ دروازہ باہر سے بند تھا۔

جعفری۔ جی نہیں اندر سے بند تھا۔ میں نے دھکا مار کر توڑا ہے۔ کسوقت؟ ابھی تقریباً پونے پانچ بجے۔

مراد علی۔ اچھا قبل اس کے کہ میں آپ لوگوں کا مفصل بیان قلم بند کروں کمرے کا معائنہ کرونگا۔ قفل کھول دیجئے۔

سب لوگ حسب ہدایت باہر کھڑے رہے۔ صرف انسپکٹر، سب انسپکٹر اور جعفری اندر داخل ہوئے۔

سب سے پہلے جو بات انسپکٹر کے مشاہدہ میں آئی وہ یہ تھی اس کمرے میں چار کھڑکیاں تھیں۔ دو دروازہ کی جانب اور دو اسکے مقابل۔ مگر چاروں کھڑکیاں اندر سے بند تھیں۔ صرف ایک روشندان تھا۔ جس میں بہت مضبوط اور موٹی جالی لگی تھی۔ اس کمرے میں ہمہ اقسام کی چیزیں جمع تھیں جس پر منوں گرد جمی ہوئی تھی۔ گویا کمرے کو صفائی کی نوبت نہ آنے سے ایک کباڑ خانہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایک کونے میں پلنگ بچھا تھا۔ جس پر نعش پڑی تھی۔ اور سر سے پیر تک کمبل سے ڈھکی ہوئی تھی۔

کیا کمبل اسی طرح پڑا تھا انسپکٹر نے پوچھا۔ جی ہاں بالکل اسی طرح۔ جعفری نے کہا۔ لیکن میں نے سرسے ہٹا کر دیکھا ضرور ہے۔ اوس کے بعد ویسے ہی ڈال دیا۔ انسپکٹر نے کمبل ہٹا کر دیکھا تو یعقوب کی نعش پڑی ہے۔ بستر پر خون جمع تھا۔ لیکن یہ خون بالکل تازہ معلوم ہوتا تھا۔ جس سے یہ پتہ چلا کہ یہ واقعہ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو گھنٹے قبل کا ہوسکتا ہے۔ داہنا ہاتھ یعقوب کا پلنگ پر پھیلا تھا اور بایاں پیٹ پر رکھا تھا۔ ایک "کراپ" استرا گردن کے پاس پڑا تھا اور گلا کٹا ہوا تھا۔ ان تمام واقعات کے دیکھنے سے انسپکٹر کی حیرت دم بدم بڑھتی جاتی تھی اور اس کے کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی . . . .

. . . . کمرہ کی تمام چیزوں کو غور سے دیکھنے کے بعد دروازہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اندر کی جانب اسمیں نیچے کی طرف ایک لوہے کی مضبوط سٹکنی لگی تھی۔ سٹکنی کا وہ حصہ جو چوکھٹ میں لگا تھا نکلا ہوا علیحدہ پڑا تھا۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ سٹکنی اندر سے بند تھی۔ متعدد بار زور زور سے دھکے مارنے پر ٹوٹ گئی جس سے دروازہ کھل گیا۔ انسپکٹر کو ایک دم کچھ خیال آیا۔ پلنگ سے نہایت

احتیاط کے ساتھ استرا اٹھایا کہ انگلیوں کے نشان دیکھے۔ لیکن تمام خون ہی خون بھرا تھا اس لئے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اسکے بعد کمرے کو بدستور بند کر کے سب لوگ برآمدہ پر بیٹھ گئے۔ انسپکٹر صاحب کچھ دیر سر کھجلا کر کچھ غور کرتے رہے اوس کے بعد بیانات قلم بند کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے جعفری کا بیان ہوا۔ یعقوب اور اسکے گھر کے متعلق روزمرہ کی زندگی کے متعلق سوالات ہوئے اس مکان میں رہنے والونکے آپس میں تعلقات وغیرہ دریافت کئے گئے۔ جعفری نے ہر ایک بات کا نہایت صاف اور تشفی بخش جواب دیا۔

آپ کو اس واقعہ کی کیوں کر اطلاع ہوی۔ کیا کوئی شور وغیرہ سنا تھا۔ انسپکٹر نے سوال کیا۔ نہیں جعفری نے کہا۔ میں اوپر سو رہا تھا۔ یکبارگی دروازہ کھٹکھٹانے اور یعقوب کی بیوی کا وحشتناک طریقہ سے مجھکو پکارنے سے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر آیا تو ماں بیٹی دونوں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کوئی بات صاف زبان سے نہ نکلتی تھی بمشکل دریافت پر اتنا معلوم ہوا کہ یعقوب کا دروازہ بند ہے اور باوجود کوشش کے اندر سے کوئی جواب نہیں ملتا۔

میں ان دونوں کو لیکر دروازہ پر آیا کئی آوازیں لگائیں۔ کواڑ کھٹکھٹایا مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ آخر دھکا دیکر دروازہ توڑا۔ اندر داخل ہوا تو یعقوب کو اس حالت میں پایا۔ پھر اسی طرح بند کر کے آپکو ٹیلیفون کرنے چلا گیا۔

کیا آپ تنہا اندر داخل ہوئے انسپکٹر نے پوچھا۔

اولاً تنہا کیونکہ مجھکو اندیشہ تھا۔ اور جب یہ حالت دیکھی تو دونوں کو اندر بلا کر دکھلایا۔

کوئی چیز تو نہیں چھوئی یا ہٹائی؟

نہیں سوائے اوس کمبل کے جسکو بدستور پلٹ دیا جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں۔ جی ہاں میرے پاس ایک نوکر ہے جو صبح سات بجے آتا ہے اور شب کو آٹھ بجے چلا جاتا ہے۔

بیوی نے بیان کرتے ہوئے بتلایا کہ کل پھر یعقوب سے لڑائی ہوئی تھی۔ اسلئے یعقوب اپنے کمرہ میں سویا

صبح چار بجنے کے کافی دیر بعد وہ اس کے کمرہ پر اسلئے گئی کہ خلاف معمول وہ ابھی تک کیوں نہیں اُٹھا۔ بہت کھٹکھٹایا اور آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ کمرہ اندر سے بند تھا۔ باقی جعفری کے بیان کی تائید کی۔ رات کو ایک عجیب بات محسوس کی یعقوب کو چونکہ دمہ کی شکایت تھی اسلئے رات بھر کھانسا کرتا تھا لیکن اس شب کو کھانسی کی آواز قطعی نہیں آئی۔ شاید وکیل صاحب کی دی ہوی دوا نے فائدہ کیا ہو۔ وہ بہت ہوشیار نیند سوتی ہے۔ اسکو کسی قسم کی آواز یا آہٹ محسوس نہیں ہوئی۔

دوا کے نام پر انسپکٹر ذرا چونک گیا۔ پھر خاموشی سے واقعات پر غور کرنے لگا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی جو اسکو صحیح راستہ پر لیجائے۔

جعفری۔ اس میں کیا شک ہو سکتا ہے کہ اس نے خودکشی کی۔

داروغہ۔ مجھکو بھی اس بات کا یقین ہے کیونکہ کمرہ کی ہر کھڑکی اور دروازہ اندر سے بہت احتیاط کے ساتھ بند تھا پھر قتل کیونکر ہو سکتا ہے۔

انسپکٹر۔ (دل میں) صحیح ہے۔ ایسی خودکشی میں نے آجتک نہیں دیکھی کہ گلا کاٹ کر کمبل اوڑلے یا کمبل اوڑھکر گلا کاٹے۔ اس قدر اطمینان سے لیٹ کر گلہ کاٹنا بالکل اچھوتہ طریقہ ہے۔ پھر گلہ کاٹنے کے بعد چلانا اور تڑپنا ضروری تھا۔ مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ قطعی ناممکن) ہاں جعفری صاحب میرا بھی یہی خیال ہے کہ خودکشی کی۔ لیکن کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

جعفری۔ میرے خیال میں تو گھوڑ دوڑ میں بُری طرح ہارا ہے۔ اسی وجہ سے خودکشی کرلی۔

انسپکٹر۔ لیکن آپ یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہارا تھا۔

جعفری۔ اندازہ یہی ہے۔ کیونکہ کل بہت ست نظر آرہا تھا۔

انسپکٹر۔ (کچھ سوچکر) یعقوب کو آپ کسی قسم کی دوا دیا کرتے تھے۔

جعفری۔ میرے پاس دمہ کی مجرب گولیاں ہیں وہی اسکو استعمال کیلئے دیتا تھا۔ کتنے عرصہ سے؟ انسپکٹر نے پوچھا۔ تقریباً دو ہفتہ سے جعفری نے کہا اور اسکو کافی فائدہ ہو چلا تھا۔

انسپکٹر نے ٹھلنا موقوف کر دیا۔ داروغہ جی کو ہدایت دی کہ وہ وہیں ٹھہریں اور وکیل صاحب کا نوکر آنے پر
اوس کا بھی بیان لے لیں۔ اگر کوئی خاص بات معلوم ہو تو ٹیلیفون نمبر ۵۲۱۷ پر انکو اطلاع دیں۔ مجھکو چند
ضروری کام ہیں۔ واپسی میں شاید دیر ہو اس وقت تک میرا انتظار کیجئے انسپکٹر نے کہا اور چلدیا۔
نوکر نے کوئی خاص بات نہیں بتائی۔ مرحوم اور وکیل صاحب کے تعلقات عمدہ بتلائے۔ اکثر اوقات
وقت ضرورت وکیل صاحب سے روپیئے حاصل کرتے ہوئے اوس نے دیکھا تھا جو عمدہ تعلقات کی خاص
دلیل ہے۔ سہ پہر میں یا تین بجے کے قریب انسپکٹر مراد علی واپس آئے۔ داروغہ جی سے پوچھا کہ کوئی خاص بات
معلوم ہوئی

داروغہ جی۔ کچھ نہیں۔ ملازم کے بیان سے بھی کوئی بات ظاہر نہیں ہوتی۔ اب اس میں دیر کرنا فضول ہی معلوم
ہوتا ہے۔ معاملہ بالکل صاف ہے۔

مراد علی کے چہرہ پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی خاص بات معلوم کرنا چاہتا ہے
جس کا پتہ نہیں لگا۔ آخر کرسی پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں میں سر لیکر کچھ سوچتا رہا۔ پھر کہا میری عمر میں
یہ پہلی تفتیش ہے جو اس قدر دلچسپ اور غیر معمولی ہے۔ ذرا مجھکو نوکر کا بیان سنائیے۔ داروغہ صاحب نے
بیان سنایا۔ جب روپیئے کے لین دین کا قصہ سنا تو ایکدم سے کیا کہکر کھڑا ہو گیا۔ اسکے چہرہ پر کامیابی
کی مسرت دوڑ گئی۔ مگر دوسرے ہی سکنڈ وہ پھر بالکل خاموش تھا گویا اس نے کوئی اہم بات نہیں سنی۔

جعفری صاحب کہاں ہیں انسپکٹر نے دریافت کیا۔

ایک کانسٹبل جعفری صاحب کو انکے کمرہ سے بلا کر لایا۔

انسپکٹر۔ معاف کیجئے گا آپ کو بہت تکلیف دی گئی۔ مگر میں یعقوب کی دوکان کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ شاید
وہاں کسی بات کا انکشاف ہو۔ آپ بھی ہمراہ ہوں تو زیادہ اچھا ہے۔

بہت خوب..... ضرور..... میں آپکی مدد کے لئے ہر وقت اور ہر طرح تیار ہوں۔ جعفری نے کہا۔
ایک کانسٹبل کو موقع پر چھوڑ کر سب کے سب چلدیئے۔ دوکان پر پہونچکر انسپکٹر صاحب نے کچھ یونہی دیکھا بھالا

اسکے بعد داروغہ جی کے کان میں چپکے سے کہکر چلدیئے ۔جعفری صاحب آپ اور داروغہ صاحب تلاشی مکمل کرکے مجھ سے اپنے مکان پر ملئے میں وہیں پہونچ جاؤں گا"۔

یہاں سے نکلکر مراد علی سیدھا جعفری کے کمرہ پر پہونچا۔ نوکر موجود تھا۔ اس سے کہا کہ جعفری صاحب ابھی آتے ہیں۔ انہوں نے چاء تیار رکھنے کو کہا اور اس عرصہ میں میں ذرا ڈاڑھی بنانا چاہتا ہوں شیونگ کا بکس لادو۔ نوکر نے حکم کی تعمیل کی اور چاء بنانے چلا گیا۔ انسپکٹر صاحب نے جلدی سے بکس کھولا۔ اسمیں دو استروں کے کیس تھے۔ ایک "کراپ" اور ایک "کاضمن" دونوں کو کھولا۔ تو انسپکٹر کے مسرت کی کوئی حد نہ رہی۔ اسلئے کہ کاضمن استرا تو موجود تھا لیکن کراپ غائب۔ برش سے ڈاڑھی میں صابن لگاتے ہوئے کمرہ کے ہر کونے اور ہر چیز کو غور سے دیکھا۔ ایک آرٹ میٹل کی الماری ایک کونے میں رکھی تھی اسکو کھولنے کی بیحد کوشش کی لیکن کھلی نہیں۔ اپنی جگہ آکر بیٹھا ہی تھا کہ نوکر نے واپس آکر کہا کہ حضور چاء تیار ہے۔

انسپکٹر۔ اچھا ذرا ٹھہر دمیں ڈاڑھی بنا چکوں۔ وکیل صاحب بھی اس عرصہ میں آجائیں گے۔ مگر یہ تو بتاؤ بھئی یہ استرا تو بہت ہی خراب ہے اس سے ڈاڑھی بنتی ہی نہیں۔ کوئی اور استرا نہیں ہے۔

نوکر ۔ جی ہاں ایک اور اسی میں ہوگا۔

انسپکٹر۔ کیا صرف دو ہی ہیں۔

نوکر ۔ جی ہاں دو ہی ہیں۔

اس درمیان میں شیو ختم ہو چکا تھا۔ شیونگ کا بکس بدستور رکھ دیا گیا۔ انسپکٹر صاحب منہ دھوکر یہ کہتے ہوئے کہ میں ابھی آیا باہر چلے گئے۔ پبلک ٹیلیفون پہونچکر گرے کمپنی سے ملایا۔ ہیلو۔ تمہارا نام کیا ــــ اچھا میں انسپکٹر مراد علی ہوں......ہاں.....تم نے دیکھ لیا اچھی طرح ......وہی شخص ہے۔؟ خوب پہچانتے ہو؟ ٹھیک۔

انسپکٹر ابھی کمرہ میں داخل ہوا ہی تھا کہ جعفری اور داروغہ جی وغیرہ پہونچگئے اور چاء نوشی شروع ہوگئی۔

وکیل صاحب معاف کیجئے گا میں نے آپکی بلا اجازت آپکے استرے سے شیو کیا ہے۔ داڑھی تکلیف دہ طریقہ پر بڑھ گئی تھی۔ یہ کہکر انسپکٹر اوسکے چہرہ کو غور سے دیکھنے لگا۔ جس پر ایک لمحہ کیلئے پریشانی کے آثار دوڑ گئے لیکن فوراً جعفری نے ہنس کر کہا۔ کیا مضائقہ گھر آپ کا ہے۔

انسپکٹر۔ مگر بھئی استرا بہت خراب تھا۔ بڑی تکلیف ہوئی۔ دوسرا استرا کیا ہوا۔

جعفری۔ وہ بھی خراب ہوگیا تھا۔ میں نے کل ہی حجام کو دیا ہے کہ تیز کرلائے

انسپکٹر۔ بھئی میں نے ایک عجیب بات معلوم کی کہ کل کسی شخص نے ڈاکٹر غوری کے دستخطی پرچہ کے ذریعہ گرے کمپنی سے چار گولیاں بیہوشی کی خریدیں اور ڈاکٹر موصوف انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے پرچہ لکھا ہی نہیں۔

اب تو جعفری کا رنگ اڑنے لگا اور پریشانی بڑھنے لگی۔ مگر اپنے کو سنبھالکر کہا کیا عجیب بات ہے

انسپکٹر۔ اور داروغہ جی آپ کو تعجب ہوگا کہ میں اس نتیجہ پر پہونچ گیا ہوں کہ یہ خودکشی نہیں بلکہ قتل عمد ہے

داروغہ جی۔ لیکن ثبوت؟ ناممکن ہے۔ قاتل اندر سے کیونکر نکل سکتا ہے۔

انسپکٹر۔ ممکن ہے میں غلطی پر ہوں۔ لیکن میں نے ایک طرح اس مسئلہ کو حل کرلیا ہے۔ قاتل نے ڈاکٹر غوری کے جعلی دستخط بناکر کل گرے کمپنی سے چار گولیاں بیہوشی کی خریدیں۔ ایک گولی کے استعمال سے انسان کم از کم چھ سات گھنٹے بیہوش رہ سکتا ہے۔ ان گولیوں میں سے ایک یا دو گولیاں مقتول کو بطور دوا کے دی گئیں۔

جعفری۔ غلط ہے کوئی شخص بلاوجہ ایسی ذلیل حرکت نہیں کرسکتا۔ جعفری سر سے پیر تک اسوقت پسینہ میں شرابور تھا

داروغہ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ قتل کس طرح کیا گیا۔ اور قاتل باہر کیوں کر نکلا۔

انسپکٹر۔ بہت آسان۔ قتل اس وقت تک نہیں ہوا جبتک کہ دروازہ نہیں توڑا گیا۔ اسوقت تک مقتول صرف عالم بیہوشی میں تھا۔ اسکے بعد پہلا شخص جو اندر داخل ہوا اس نے بہت پھرتی سے چشم زدن میں نہایت تیز استرے سے اسکا گلا کاٹ کر استرے کو وہیں چھوڑ دیا۔

جعفری ایک دم سے اٹھا اور چیختا ہوا کہ نہیں ہرگز نہیں۔ میں نے نہیں کیا۔ میں نہیں جانتا۔ بھاگنے کی

کوشش کی۔ مگر کانسٹبلوں نے فوراً گرفتار کرلیا۔

داروغہ۔ اس حرکت سے تو ثابت ہے کہ آپ کا قیاس صحیح ہے لیکن مقصد کا پتہ نہیں چلتا۔ جس سے ثبوت کمزور ہوجاتا ہے۔

انسپکٹر۔ ابھی لیجئے۔ جعفری کی جیب سے کنجیاں نکال کر آرٹ میٹل کی الماری کھولی۔ ایک لکٹ کے ڈبے میں سات ہزار کے نوٹ اور ایک ڈبیہ دوائی گولیوں کی جس میں دو گولیاں موجود تھیں۔ اور گرے کمپنی کا لیبل لگا تھا۔ برآمد ہوئیں۔

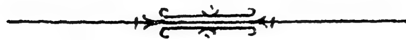
داروغہ۔ واللہ آپ نے کمال کیا۔ مگر یہ سب باتیں معلوم کیونکر ہوئیں۔

انسپکٹر۔ جس وقت پہلی بار ہم لوگ پھاٹک میں داخل ہو رہے تھے آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے کوئی چیز زمین پر سے اٹھائی تھی۔ وہ گرے کمپنی کا کیش میمو ۱۷/۱۳ تھا۔ جس پر خون کے دھبے تھے اور ان ہی دھبوں سے میری توجہ اس کاغذ کی طرف گئی۔ معائنہ موقع کے بعد جب میں آپ لوگوں سے رخصت ہوکر گیا تو سیدھا گرے کمپنی پہونچا۔ وہاں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ دوا ایک شخص نے کل ڈاکٹر غوری کی چھٹی بتلا کر خریدی تھی۔ ڈاکٹر غوری سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ انہوں نے کوئی چھٹی کسی قسم کی نہیں لکھی۔ میرے روبرو اُسوقت کئی امور تھے اول تو یہ یقین تھا کہ خودکشی کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔ علاوہ اسکے خودکشی کا یہ طریقہ عجیب تھا۔ جو میری رائے میں قطعی ناممکن ہے۔ پھر گولیوں کی خرید۔ وہ بھی دستخط بنا کر۔ پھر رسید کا پھاٹک کے پاس ملنا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ چیز یعقوب کے لئے ہی دستیاب کی گئی تھیں، اور استعمال بھی کی گئیں۔ پھر وکیل صاحب کا دوا دینا اور آج شب کو کھانسی کی آواز نہ سنائی دینے نے میرے شبہ کو وکیل صاحب کی طرف منتقل کردیا۔ پھر قتل کی کیا شکل ہوسکتی تھی سوائے اسکے کہ جب یہ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے تو فوراً ہی کمبل کا آڑ کرکے استرے سے گلا کاٹ دیا۔ اور استرا وہیں ڈالدیا۔ یہ اس قدر آسان تھا کہ عورتیں اسکو نہ دیکھ سکیں۔ اور شبہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ گلہ کاٹنے میں چونکہ کچھ خون ہاتھ میں لگ گیا تھا۔ اسلئے

وہ ہات فوراً اور کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ جو نہ صرف سردی ملکہ استرا رکھکر لانے کیلئے پہن لیا تھا۔ اسکو اس بات کا یقین تھا کہ صبح چار بجے جب یعقوب حسب معمول نہ اٹھے گا تو بیوی پریشان ہوگی اور آخر کار اسکی مدد طلب کرے گی کیونکہ اور کوئی مرد گھر میں نہیں رہتا۔

جیب میں رسید پڑی تھی۔ چنانچہ اس خیال سے کہ کپڑا خراب نہ ہو کاغذ میں ہاتھ پونچھ لیا۔ اور ٹیلیفون کے لئے جاتے وقت اسکو باہر پھینک دیا۔ ریس آفس میں تحقیقات کے بعد مجھکو معلوم ہوا کہ یعقوب نامی ایک شخص کو پرسوں سات ہزار کی لاٹری نکلی ہے۔ مجھکو یقین ہوگیا کہ قتل کی وجہ یہی روپیہ ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ قتل کے بعد جعفری کو روپیہ کس طرح ملیگا۔ گمان تھا کہ شاید اوسکو معلوم ہوگا کہ اوس نے کہاں رکھا ہے۔ لیکن نوکر کے بیان اور دوکان کی تلاشی نے ثابت کردیا کہ اوس نے یہ روپیہ وکیل صاحب کے پاس ہی رکھا تھا۔ کیونکہ وہ اکثر اپنا روپیہ انکے پاس رکھوادیا کرتا تھا۔ مگر وکیل صاحب کی نیت بدل گئی اور دوائے شفا کی بجائے دارو بیہوشی استعمال کروادیا۔

آپ سے جو میں نے دوکان میں کہا تھا کہ تلاشی میں کم از کم آدھ گھنٹہ صرف کرنا اور اس کے بعد مقام واردات پر پہونچ جانا وہ اس مقصد کے تحت کہ گرے کمپنی کا مینجر جسکو میں نے ٹیلیفون کے ذریعہ ہدایت کردی تھی کہ دوکان پر دیکھکر پہچان لے کہ وہی آدمی ہے یا نہیں جس نے دوا خریدی تھی۔ اسکی تصدیق ہوگئی۔ اسی عرصہ میں گھر آکر میں نے استرے کا راز بھی دریافت کرلیا۔



قصۂ پارینہ

از

مولوی سید ابو الفضل صاحب (جامعہ عثمانیہ)

"یہ واقعہ بھی عجیب و غریب حالات میں واقع ہوا" میرے ساتھی نے ڈنر کے بعد سگار جلاتے ہوئے کہنا شروع کیا "یہ واقعہ جینوا اور روم کے درمیان چلنے والی ریل کے ایک تنگ ڈبے میں ہوا۔ اطالوی ریلوں سے تو شاید تم واقف ہونگے۔ سمجھ لو کہ اس سفر میں گاڑیوں کی معمولی تکالیف کے علاوہ مجھے گرما کی اس رات میں بیٹھے ہوئے مسافروں کی گندی ہوا سے بھی دو چار ہونا پڑا۔ اس موقع پر رومانیہ کے ایک نوجوان نے میری بڑی مدد کی اس نے نہ صرف اپنے لئے ہی نشست پیدا کر لی بلکہ میرے لئے بھی نہایت آرام دہ جگہ کا بندوبست کیا۔ میں نے اسکا بے انتہا شکریہ ادا کیا۔ میری آنکھوں میں اب بھی اس رومانی کی چالاک اور شریر صورت پھر رہی ہے۔ وہی ملقانی آنکھیں، رومی شکوہ، جس میں طفلانہ شوخی اور مردم شناسی کی جھلک سے ایک عجیب امتزاج پیدا ہو گیا تھا۔

میری عادت فوراً دوستی پیدا کرنے کی نہیں لیکن اس نوجوان کی خوش طبعی نے میرے عادتی سکوت کو مغلوب کر لیا۔ جینوا سے نکلنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ہم تقریباً دوست ہو گئے۔ لیکن خوش طبعی کے باوجود بعض اوقات اخلاقی پستی دولتمند سے دولتمند شخص کو بدنام کر دیتی ہے۔ میں نے نوجوان کی ناشائستہ حرکتوں کو دیکھ کر نہایت ہوشیاری سے گفتگو کے سلسلہ کو ختم کر دیا۔

تکان سے اکتا کر میں اونگھ رہا تھا کہ یکایک گڑ بڑ نے مجھے چونکا دیا۔ گاڑی پانسر کے اسٹیشن پر پہونچی تھی، اور اس شور کا سبب ایک نئے مسافر کی مداخلت تھی۔ یہ مسافر ایک عورت .... عورت کیا! مجسم حسن کہئے! .... کیا آپ وقاف، کی ایک بے انتہا حسین نوعمر دوشیزہ کا تصور کر سکتے ہیں۔ جسکی گود میں اس کا ننھا بچہ ہو، اور وہ ریل میں آپ کے مقابل کی نشست پر جلوہ پاش ہو ـــــ بہر حال وہی میرے سامنے تھی، وہی سادہ مسحور کن حسن جس میں نشیلی آنکھوں اور مادرانہ شفقت کے امتزاج نے ایک عجیب شعری کیفیت پیدا کر دی تھی۔

اگر آپ کو تجربہ ہو تو اس بات کا بخوبی علم ہوگا کہ بعض خوبصورت عورتوں کے چہروں پر رعب، ظلم، سکوت اور راز ـــــ ان سب کا مرکب ایک عجیب و غریب جذبہ نمایاں ہوتا ہے۔ جسکی سیمابی کیفیت فوراً قلب انسانی کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ اس واقعے کو گذرے ہوئے یوں تو زمانہ ہوا ہے۔ لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہی وہ عورت تھی جس نے میرے دل کی انتہائی گہرائیوں کے خفتہ جذبات کو بیدار کر دیا .... یہ فلسفہ نہیں حقیقت ہے!!

اسی مستعد آدمی نے ہمارے ڈبے میں اس عورت کیلئے اچھی جگہ تلاش کر دی۔ میں نے اس ہمدردی سے خوش ہو کر اس سے پھر سلسلۂ کلام جاری کر دیا۔ اسی جگہ ایک بھدے سر والا چہرہ بھی کھڑکی میں سے داخل ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ جسکو فرسودہ عینک کے شیشوں نے اور بھی بدنما بنا دیا تھا۔ یہ غالباً اس حسن مجسم کا مطیع شوہر تھا۔ اثنائے گفتگو میں متعدد مرتبہ اسکی بکرے کی سی ڈاڑھی عورت کے چہرے کے قریب قریب سے گزر گئی۔ آخر کار بیوی نے شوہر سے کہا کہ وہ اپنے لئے کوئی مناسب جگہ تلاش کر لے جس کے جواب میں اس نے کہا۔

"میں خوش ہوں .... اس ڈبے کی نشست ملنے سے بے حد مسرور ہوں ...... مجھے اپنی خوشی کی پرواہ بھی نہیں ـــــ صرف تم اور ...... چھوٹا بابو مطمئن ہوں تو بس ہے مجھے اس وقت باوجود تکلیف کے خوشی معلوم ہونے لگتی ہے۔" یہ کہکر وہ عجیب مسکراہٹ کے ساتھ باہر چلا گیا۔

ٹرین سست اژدھے کی مانند پر سکوت میدان سے گزر رہی تھی۔ آسمان میں صرف تاروں کی حکومت تھی

میری نیم خفتہ آنکھیں بے اختیار اس عورت کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ اسکو دیکھتے دیکھتے غم کی ایک نامعلوم لہر میرے دل و دماغ پر چھاگئی۔ میں نے محسوس کیا کہ زندگی بھر صرف اسی عورت کی جستجو میں تھا۔ جس کا حسن اور تبسم اس دنیا کی پیداوار نہیں ہو سکتے ——— اور میں اسے پایا بھی تو کب؟ جبکہ وہ دوسرے کی ملک ہو چکی تھی۔ اس مضحکہ خیز، چشمے والے ڈاکو نے مجھ سے ہمیشہ کیلئے چھین لیا تھا، لیکن کیوں؟

اسی افسوس ناک تصور میں تکان پھر مجھ پر غالب آگئی۔ سب سے آخری تصویر جو میری آنکھوں میں باقی رہ گئی، وہ جھکی ہوئی عورت کی تھی جو بلکتے ہوئے بچے کو تسلی دے رہی تھی اور رومانی اس کام میں اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ اور ٹوٹی پھوٹی اطالوی زبان میں گفتگو بھی کر رہا تھا۔

میں اونگھتے اونگھتے سو گیا ——— میرے خواب بھی نہایت عجیب تھے۔ ان میں سے ایک یہ ہے میں نے دیکھا کہ اسی عورت کے پیچھے پیچھے کسی دھوپ سے تپتے ہوئے صحرا میں چلا جا رہا ہوں۔ دھوپ کی تیزی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہی تھی۔ ریت سے میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ جن سے خون بہ رہا تھا۔ یکایک افق پر دھوئیں کا ایک خط نظر آیا اور کچھ جانوروں کی آوازیں اس سکوت میں خلل انداز ہونے لگیں۔ عورت دھوئیں کی طرف چلنے لگی۔ ہم آگ کی ایک بڑی ڈھیر کے قریب پہونچے جو بالکل بجھ چکی تھی، وہاں تین شکلیں پھر رہی تھیں۔ وہ تینوں بالوں سے لدے ہوئے گوریلے تھے۔ ایک تو بالکل برہنہ تھا۔ ایک پاجامہ پہنے ہوئے تھا اور تیسرا عینک لگائے تھا۔

جب انکی نظریں عورت پر پڑیں تو وہ اچھل پڑے۔ شیطانی قہقہے لگاتے ہوئے وہ پہلے آگ کے اطراف اور پھر اس عورت کے گرد کودنے پھاندنے لگے۔ یہ ناچ تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ بالآخر وہ بالکل گرداب بنگیا جس کے وسط سے عورت کی سہمی ہوئی چیخیں سنائی دے رہی تھیں اس میں گوریلوں کی بھیانہ آوازیں بھی شامل تھیں۔

میں اپنی ساری قوت اکٹھی کر کے ان پر حملہ کرنے کو تھا کہ خوف سے دم بخود رہ گیا ——— میں نے دیکھا کہ وہ آگ، عورت اور گوریلے سب کے سب دنیا کے دوسرے کنارے پر ہیں۔ وسیع ریت کا سلسلہ میرے قدموں کے نیچے سمندر سے ہمکنار ہو رہا ہے۔ ان کو ڈرانے کے لئے میں نے پکارنا چاہا۔ لیکن ایک زیادہ عظیم تر واقعے سے

میں اور زیادہ پریشان ہوگیا..... اس عورت کا چہرہ یکایک گوریلے کی شکل میں تبدیل ہوگیا اور وہ بھی اسی وحشیانہ انداز سے ان کے ساتھ رقص میں شریک ہوگئی۔

اب میری قوت زائل ہونے لگی۔ چکر سا آیا۔ پاؤں جواب دینے لگے میں سر کے بل اس سمندر میں گر گیا .... اٹھکر دیکھتا ہوں تو وہی رومانی مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"اٹھو! ہم اب روم پہونچ گئے ہیں"

میں نے تعجب سے چاروں طرف دیکھا۔ میری آنکھیں پھر اس کے چہرے سے دوچار ہوئیں اور خواب کے سارے واقعات یک لخت کافور ہوگئے۔ ....

ریل رکی۔ شور و غل، مسافروں کی گڑبڑ، پورٹروں کی چیخ و پکار، اور ہوٹل کے ایجنٹوں کی دھوم دھام میں میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے شوہر کے ساتھ چلتے وقت میرے ساتھی کا ہاتھ نرمی سے دبایا۔ اور فوراً روانہ ہوگئی۔ نیند کے اچاٹ ہونے سے اسکے شوہر کی آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں جب وہ چلی گئی تو میں نے محسوس کیا کہ میرے اندرونی جسم کا کچھ حصہ بھی غائب ہوگیا ہے۔ میں ہر چیز کو بھول گیا اور اپنے سامان سفر، کرایہ ہوٹل، ٹکٹ غرض اپنے ماحول سے بالکل غافل ہوگیا اور میرا سارا کام اسی رومانی نے انجام دیا۔

اُس نے مجھے لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوٹل میں پہونچا دیا۔ میں منہ ہاتھ دھویا اور لباس بدلکر چل کھڑا ہوا اور گلیوں میں بغیر کسی ارادے کے گھومنے لگا...... ابتداً میرا خیال تھا کہ وہ ضرور کہیں نہ کہیں نظر آجائیگی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ خیال جمتا گیا اور مضبوط ہوکر اسکے جس قدر جلد ہوسکے دیکھنے کی بے انتہا خواہش پیدا ہوگئی۔

مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ میں کب تک یونہی پھرا کیا۔ غالباً بہت عرصہ تک جب ہوٹل واپس آیا تو دیکھا کہ رومانی ایک گہری نیند لیکر ابھی ابھی نیچے آیا ہے میں نے اس سے کچھ گفتگو کی۔ ٹرین میں اسکی ہمدردی اور اس عورت سے رومانی کی گفتگو کا خیال کرکے میں نے اس سے کچھ مواد لینا چاہا۔ ہوٹل کی سیڑھیوں کے قریب بیٹھکر ہم نے معمولی طور پر ابتدا کی کہ روم کی سخت گرمی سے ملیریا کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ اس کے بعد میں نے ہمارے حسین ہم سفر کا ذکر یوں شروع کیا گویا میرے دل میں اس کا خیال دفعتاً پیدا ہوا ہے۔

لیکن گفتگو میں فوراً میں نے محسوس کیا کہ مجھ پر ایک عجیب بوجھ پڑ رہا ہے۔ دوران گفتگو میں اس کے چہرہ پر طفلانہ شوخی کے ساتھ ساتھ بھونڈی بزرگی کی ایک ایسی بدنما مسکراہٹ طاری تھی کہ اس سے مجھے نفرت ہونے لگی گویا اس نے مجھے صرف ایک "پاگل" سمجھ لیا۔

اسکی اس ناقابل نفرین حرکت کے سبب اور اس خیال سے کہ میں نے فضول کسی غیر سے ایسی رازدارانہ گفتگو کی، میں اس سے علیحدہ ہونا ہی چاہتا تھا کہ اس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

"تم کس بات پر ہنس رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ میری حالت لحظہ بہ لحظہ قابل تمسخر ہوتی جا رہی ہے۔" ہا ہا ہا! کیا تم اس سے محبت کرنے لگے؟ ...... یقیناً تمہیں اس سے عشق ہو گیا ہے۔ گھبراؤ مت اتفاق کی بات ہے کہ وہ بھی ہماری ہوٹل سے قریب ہی ٹھہری ہے۔ کیا تم اس سے دوبارہ ملنے کا قصد رکھتے ہو؟

"یقیناً بشرطیکہ تم مذاق میں نہ ٹالو!" اسکو مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے میں نے جواب دیا۔

"تو ذرا اپنی حالت درست کر لو اور دس منٹ انتظار کرو۔ میں نے اسے اپنا پتہ دیا ہے اور اس نے وعدہ کیا ہے کہ آج دوپہر کو شوہر کی نظریں بچا کر ایک گھنٹے کیلئے وہ یہاں آئیگی"۔

میں اسے پھر بے انتہا نفرت کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ لیکن اسکی ہنسی میں کمی نہ ہوئی دوبارہ اس نے اسی طفلانہ انداز میں سمجھانا شروع کیا۔

"سنو! میں ایک پرانا پاپی ہوں اور یہ اسکی انتہا ہے۔ میں کسی خوبصورت عورت کے قریب سے بغیر اپنا تجربہ کئے ہوئے نہیں گذر سکتا۔ یہ میری ایک کمزوری ہے ہا ہا ہا!! اور یہ بلا کی حسین عورت تو نظر انداز کرنے کے قابل ہی نہ تھی پس جب تم سو رہے تھے میں مشق کر رہا تھا۔ ...... ابتداً ہماری انگلیاں گویا اتفاقیہ مل گئیں۔ جبکہ میں اس کے لڑکے کو مدد دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کے بعد پرانی ترکیبیں شروع ہوئیں اور پھر — میں کامل کامیابی پر فخر کر سکتا ہوں۔ ساڑھے تین بجے وہ مجھ سے ملنے آئیگی۔ ...... دو دن کے بعد وہ پیرا گوئے چلی جائے گی۔ جہاں اس کے شوہر کو کسی سیاسی کام پر بھیجا جا رہا ہے۔ لہذا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے کیوں درست ہے نا؟ ہی ہی!!

میں تمہیں اس سے ملا سکتا ہوں...... اگر تم چاہو؟ یہ لو وہ آپہونچی وا اللہ کیا چہرہ ہے! میں اُمید کرتا ہوں کہ اب اگر میں اس کے ہمراہ تمہیں یہیں چھوڑ کر چلا جاؤں تو تم معاف کردو گے۔ میں رات کے کھانے پر تم سے ملونگا ــــ خدا حافظ۔

وہ اس سے ملنے چلا گیا۔ میں نے اسے ایک ہی نظر میں پہچان لیا گو اپنی آنکھوں پر یقین نہ کرنے کی میں نے بہت کوشش کی ــ یہ دوسری بار تھا؟ غلطی ناممکن تھی۔ وہی معصوم خواب کا سا چہرہ۔ پیراگینو کی لڑکی کا وہی دلربا چہرہ۔ جب وہ (بغیر میری طرف متوجہ ہوئے) میرے ساتھی سے ملنے بڑھ رہی تھی تو مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ شاعروں کا مطمح نظر لازوال نسائیت کے پرتو میں آج مجسم نظر آرہا ہے۔

چند منٹ تک میں مبہوت کھڑا رہا۔ اس کے بعد افق پر دھویں کے درمیان ناچتے ہوئے تینوں گو ریلے اس قدر واضح ہوتے گئے کہ مجھے پھر چکر سا آنے لگا۔ میں نے پھر محسوس کیا کہ عمیق سمندر کی گہرائیوں میں گر رہا ہوں ــــ لیکن ہوش آنے پر میں بے اختیار قہقہے لگانے لگا۔ صرف اس ہنسی کا میں عمر بھر اعادہ نہیں کرنا چاہتا۔ بعض وقت ہنسی کی قیمت بے انتہا عزیز ہوتی ہے! یقیناً نہایت عزیز!! بہت پیاری!!!

(ماخوذ از جیانکو لاہورن)

اے دوست

از

مولوی سید علی حسنین صاحب زیبا ام اے (عثمانیہ)

ہائے کیا شب تھی فضائے دہر پر چھائی ہوئی
جسکی تاریکی تھی پورے جوش پر آئی ہوئی

رات جو پہلی محبت کی طرح خونخوار تھی
فطرت بیدرد کی ڈھائی ہوئی تلوار تھی

پر سکوں گہرائیوں میں دل کی طوفاں خیز رات
وہ بھری برسات کی جذبات سے لبریز رات

گہرے گہرے رنگ کے بادل ہواؤں میں بھرے
پھر رہے ہیں ہر طرف اک درد بکھراتے ہوئے

ننھی ننھی بوندیاں پڑتی تھیں فرش خاک پر
یا تمنائیں برستی تھیں دل صد چاک پر

تر بتر جھونکے ہواؤں کے امنگوں سی بسے
ایک پیغام عمل تھے سرد آہوں کے لئے

منظرِ تاریک میں وہ دفعتاً اک روشنی
جاگ اٹھتی تھیں امیدیں دل کی سب سوئی ہوئی

سرنگوں تھا خوابِ راحت لذتِ غم دیکھ کر
دل بدل جاتے تھے سینوں میں یہ عالم دیکھ کر

کروٹوں پر کروٹیں تھیں نیند پر آتی نہ تھی
خواب کی ننھی پری تکلیف فرما تی نہ تھی

دل نے اک کروٹ ادھر بدلی زمانہ کی طرح
یاد آیا تو ادھر بھولے فسانہ کی طرح

دل کی وہ سنسان گلیاں جاگ اٹھیں اس یاد سے
شورشوں کا سلسلہ پیدا ہوا فریاد سے

تھے جو فرشِ خاک پر خوابیدہ نغمے چونک اٹھے
جو ربابِ دل میں تھے بیہوش نغمے چونک اٹھے

ضبط کی مضبوط بنیادیں یکایک ہل گئیں
سرد آہوں کو گذر جانے کی راہیں مل گئیں

لاکھ روکا درد لیکن دل کو تڑپا ہی گیا
لب پہ تیرا نام آنسو آنکھ میں آ ہی گیا

سٹی کلج سے

از

نواب شہید یار جنگ بہادر شہید

اے سٹی کالج تجھے ہیں یاد وہ ایام بھی
تیرے مشتاقوں میں لکھا تھا ہمارا نام بھی

تو ابھی کالج نہ تھا اُن روزوں میں اسکول تھا
گلشن علم و ادب میں نوشگفتہ پھول تھا

تیرے دامن سے بندھے وابستگان علم تھے
قدرداں اونکا تھا تو وہ قدردان علم تھے

تو ہی تھا وہ جس کے سر رہتا تھا سہرا علم کا
تشنہ کاموں کے لئے بہتا تھا دریا علم کا

اب بھی باقی ہیں جو تجھسے تربیت پائے ہوئے
علم کے دربار میں ہیں منزلت پائے ہوئے

یاد ہیں ابتک ہمیں سب لطف وہ لوٹے ہوئے
ہو گئی ہے ایک مدت بزم سے چھوٹے ہوئے

ڈھونڈتا ہے دل ہمارا پھر اوسی آرام کو
صبح کے نکلے ہوئے آتے تھے گھر میں شام کو

وہ زمانہ بھی گیا وہ ساتھ والے بھی گئے
دن کی آہیں بھی گئیں اور شب کے نالے بھی گئے

ساتھ والوں میں یہی باقی ہیں بس اب دو چار ہیں
ایک ہیں خورشید اک مرزا ہیں اک انوار ہیں

کیا زمانہ تھا کہ اک مستی سی تھی چھائی ہوئی
علم کے سرشار ہم تجھ پر بہار آئی ہوئی

بس لبوں پر آکے تھم جاتی ہے اب فریاد بھی
جب بھلایا ہم کو تو نے لے لے اپنی یاد بھی

سر پٹکتے ہیں کہ دل کا حوصلہ جاتا رہا
گرد رہ ہم رہ گئے اور قافلہ جاتا رہا

آ رہی ہے اون کی کانوں میں ابھی آواز بھی
سوز بھی ابتک وہی ہے اور وہی ہے ساز بھی

دن کٹینگے کس طرح یہ بس اسی کی فکر ہے
لطف رونے میں نہیں ہنسنے کا اب کیا ذکر ہے

شمع علم و فضل کا ہر ایک پروانہ رہے
دیتے ہیں لیکن دعا آباد میخانہ رہے



درسگاہ کا انتخاب

از

پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ام اے ال ال بی

۱۹۲۰ء میں جب میں مڈل اسکول کے امتحان سے فارغ ہوا، آیندہ مدرسہ کے انتخاب کا سوال میرے بزرگوں کیلئے ایک اہم مسئلہ بن گیا۔ شہر بھر میں بیسوں فوقانیہ مدرسے تھے، اور مشورہ دینے اور فیصلہ کرنے والوں کی دلچسپیاں بھی اتنی ہی متنوع تھیں۔ میرے قدیم مدرسہ کے صدر مدرس صاحب اور ہیڈ مولوی صاحب، جن کی مجھ پر خاص نظر عنایت تھی، مصر تھے کہ میں اسی مدرسہ کی جماعت عثمانیہ میٹرک میں شریک ہو جاؤں۔ میرے بڑے بھائیوں کی رائے دارالعلوم میں شریک کرنے کی تھی۔ کیونکہ یہ حضرات اسی برگزیدہ درسگاہ کے فیض یاب ہیں چند ساتھی، دوست، احباب چادرگھاٹ ہائی اسکول میں شرکت کے متقاضی تھے۔ لیکن میرے دماغ پر سٹی ہائی اسکول کے درخشاں نتائج اور نظم و نسق کی خوش اسلوبی کی روایات مسلط تھیں۔ کہیں پر مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ اس درسگاہ سے ہمیشہ صد فی صد امیدوار کامیاب ہوتے ہیں۔ کسی جگہ یہ خبر سنی تھی کہ ممالک محروسہ کے کامیاب امیدواروں میں سب سے زیادہ ممتاز کامیابیاں اسی ادارے کے حصے میں آتی ہیں یہ اور اس طرح کی بیسوں ہمت افزا خبریں تھیں جن کو سن کر، میرا دل بے دیکھے اس مدرسہ کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ یہ ایسی لگن تھی کہ اسکے مقابلے میں تجربہ کار اساتذہ اور شفیق بھائیوں کے مشورے سب دھرے کے دھرے رہ گئے اپنے قدیم ہم جماعتوں کے مخصوص حلقہ سے

تنہا میں اجتہاد کرکے، کسی کو ناراض اور کسی کو متاسف چھوڑ کے، اپنے ذہن کی منتخب کردہ، "نصب العینی" درسگاہ میں شریک ہونے کے لئے چلا۔

اس سے پہلے کسی معاملے میں بھی یکہ وتنہا ہاتھ ڈالنے کا مجھے کم اتفاق ہوا تھا اسلئے والد قبلہ کو پشت پناہی کیلئے اپنے ساتھ لے لیا۔ اور چونکہ کچھ تو اپنے درجہ اول ہی کامیابی کے صلہ میں اور کچھ اپنی کم استطاعتی کی بناء پر مدرسہ سے وظیفہ کا متمنی تھا اسلئے چلنے سے پہلے یہ اہتمام کرلیا کہ لباس اور وضع قطع میں کوئی جھلک بھی ایسی نہو جو اپنے دعویٰ کو مشتبہ بنا سکے۔

اس ہیئت کذائی سے ہم مدرسہ پہنچے۔ پرنسپل صاحب کی خوش وضعی، رعب داب اور ہمدردانہ گفتگو دیکھ کر ہی مجھے اپنے انتخاب اور والد قبلہ کو میری رائے پر ناز محسوس ہونے لگا۔

سٹی کالج کی موجودہ شاندار عمارت اور خاموش فضا میں تعلیم پانے والے یہ نہ سمجھیں کہ میری پسند ظاہری شان وشوکت سے بھی متاثر تھی۔ اس وقت مدرسہ کا ظاہری اثاثہ یہ تھا۔

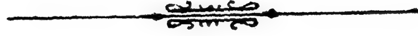
مدرسہ کی اپنی ذاتی عمارت کے نقشے ابھی اسکے معماروں کے ذہنوں ہی میں تھے۔ مدرسہ کا تحتانی حصہ پتھر گٹی کے قدیم ترین مکان میں تھا۔ وسطانی اور فوقانی جماعتوں کے درس سالار جنگ بلڈنگ کی اس بالائی حصہ میں ہوتے تھے جس کا زیرین حصہ آج کی طرح اس وقت بھی "نی سنڈیکیٹ"۔ "جنٹلمن بیڑی"۔ "دار التفریح"۔ اور شہر کے قدیم ترین "مغل کے ہوٹل" جیسی چیزوں کے لئے مخصوص تھا۔ خود جناب پرنسپل صاحب کا اجلاس مغل کی ہوٹل کی چھت پر تھا۔ اور اگر سچ پوچھو تو مقام بڑے منچ کا تھا۔

مدرسہ کے وہ فضا بہت سوں کے ذہنوں میں ابتک تازہ ہوگی جماعتی درس کے دوران ہی میں بھی کبھی وہ نقشے نظر آئے ہیں کہ دل بھلا نہیں سکتا۔

کسی وقت کسی چٹ پٹے سالن کے بگھار کی مہک سے مشام روح تازہ رہتی تھی۔ کسی وقت نانبائی کے تنور سے تازہ تازہ نکلے ہوئے، ہلکے ہلکے رنگوں کے خستہ کلچوں کے ڈھیر ایک طرف جنت نظر کا سامان رکھتے تھے، تو دوسری طرف اشتہا انگیز۔ وقفوں وقفوں سے ہوٹل کے لڑکوں کی "دو پونے، دو لقمیاں۔ چار شکلپو، تین ہاف ڈبل، کی نغمہ ریز صدا، فردوس گوش بن جاتی تھی۔ سامان سے لدی ہوی

بیلوں گاڑیوں کے چاکوں کے زیر و بم، لکچر سننے والوں کو، لکچرار، استاد، جماعت، غرض دنیا و مافیہا سے بلکہ خود اپنی ہستی سے بھی دم بھر کیلئے بے خبر بنا دیتے تھے۔ دو تیز رفتار موٹروں کا ٹکرانا، طالب علموں کے لئے متحرک اجسام کے تصادم کے حکمی مسئلہ کا عملی تجربہ تھا۔

شہر بھر کی دوڑ دھوپ اور انتشار کا یہی وہ مرکز تھا، جس کے پہلو بہ پہلو ایک انتظام کی پرورش ہو رہی تھی۔ اور یہی وہ پُرشور فضا تھی جس کے قلب سے ایک عظیم تر سکون نما اضطراب اُٹھنے والا تھا۔



میری بے قراری

از مولوی نوراللہ محمد صاحب نوری

اللہ ری میری بے قراری — سکتہ سیماب کو ہے طاری
رنگین تمام پیرہن ہے — آنکھوں سے ہے جوئے خون جاری
ہر دم ہے تمہارا ہی تصور — ہر دم ہے تمہاری یاد جاری
جینا دشوار ہو گیا ہے — وہ دل پہ لگا ہے زخم کاری
ہے سینہ زنی جو ہاتھ کا شغل — آنکھوں کا ہے کام اشکباری
آتش سے ہے گویا آب درکار — تجھ سے الفت کی خواستگاری
دل ہی قابو میں جب نہیں ہے — ہو کس طرح واقعہ نگاری

نوری کیوں ہے یہ شکوہ و شکایت
ہے زیست کے ساتھ آہ و زاری

میرا زمانۂ تعلیم

از

مرزا محمد علی بیگ صاحب ام اے (اکسن) نائب ناظم جنگلات

میں جب زیر تعلیم تھا تو یہ سٹی ہائی اسکول کا وہ زمانہ ہے جبکہ مسٹر راس صدر مدرس تھے اور پنڈت اتمارام مدرس حساب ۔ یہ کمبا کونم کے باشندے تھے جہاں کی آب و ہوا ہی میں ایسی خاصیت تصور کی گئی (اور کیجاتی ہے) کہ وہاں کے رہنے اور پرورش پانے والے حساب کے بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ اس وقت ہمارے ایک استاد مولوی حمید الدین صاحب انگریزی اور اردو دونوں کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے۔

ہمارے زمانہ میں امتحان میں تحریری پرچوں اور نمبرات کے اندراج کا طریقہ رائج نہیں ہوا تھا بلکہ لڑکے جیسی نشست رکھتے تھے اس کے مطابق ان سے اساتذہ زبانی سوال کرتے تھے اور جو صحیح جواب ادا کرتا اس کو ان طالب علموں سے اوپر کی نشست دیجاتی تھی جو یا تو جواب ادا نہ کرتے یا غلط ادا کرتے تھے۔

اس طریقۂ عمل کی وجہ سے اکثر طالب علموں کی یہ خواہش تھی کہ ہم سب کے آخر کی نشست لیں اور سب سے اوپر کی نشست حاصل کریں۔ چنانچہ میں خود اس طرح کلاس میں سب کے آخر میں بیٹھتا اور ختم کلاس تک اول یا دوسری نشست حاصل کرتا۔

پنڈت آتمارام صاحب زبانی حساب کے طریقوں سے خوب واقف تھے اور جبر و مقابلہ کے فارمولوں کے تحت اکثر حسابات کے سوالات کو حل کرتے تھے۔ چنانچہ اس طریقے سے انہوں نے چند سوالوں کے حل کے طریقے بتلائے تھے جن میں سے ایک دو درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

(۱) کسی ایک سلسلہ اعداد کو زبانی جمع کرنا مثلاً ایک سے اکیس تک جمع کرو:۔

بلحاظ Formula of Arithmetical Progression حسب ذیل حل ہوسکتا ہے $\frac{۲۱ \times ۲۲}{۲}$ = ۲۳۱

(۲) کسی ایک عدد کو پانچ یا پانچ کے المضاعف اور ان کے المضاعف سے زبانی ضرب دینے میں ایک کو صفر لگا کر ۲ یا ۴ یا ۸ وغیرہ سے تقسیم کرلیا جائے تو صحیح مضروف زبانی حاصل ہوسکتا ہے۔

مسٹر کرانی انسپکٹر صاحب مدارس مدرسہ کی جماعت ہائے اول، دوم، سوم، میں امتحان سالانہ لیا کرتے تھے اور ان کے نتائج کے لحاظ سے دوسرے درجہ میں ترقی دی جاتی تھی۔ اس وقت بھی ان چھوٹی جماعتوں کے امتحانات زبانی ہوا کرتے تھے اور سلیٹ پر جواب لکھے جاتے تھے۔ مسٹر کرانی کے سوالات ختم ہونے سے پہلے ہی میں جوابات ادا کردیتا تھا۔ جس پر وہ خوش ہوتے اور کہتے کہ اتنی تیزی اچھی نہیں۔ ایک سوال یاد آیا اور وہ یہ تھا کہ دریائے نربدا اور تاپتی کے درمیان .... ان کے اتنا کہنے کے ساتھ ہی میں وندیاچل پہاڑ لکھ کر تختی الٹ دیتا تھا۔

غرض یہ چند واقعات ماسلف گوش گذار کئے جاتے ہیں کہ میگزین میں کچھ قدیم واقعات کا اظہار بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔



مدرسہ کی یاد

از

مولوی محمد عمر مہاجر صاحب

بہت دنوں کی بات ہے۔ اس زمانے کی جبکہ میں صرف پانچ برس کا تھا۔ بھائی صاحب مدرسہ کے تذکرے کیا کرتے تھے، کہتے تھے ہمارا مدرسہ بہت بڑا ہے....... بہت سی سیکلیں ہیں...... ہم ڈسک پر بیٹھتے ہیں....... استاد ایک اونچی کرسی پر بیٹھتا ہے.........

میری نظروں کے سامنے مدرسے کا ایک عجیب سا نقشہ پھرنے لگتا اور میں ایک معصوم فکر میں غرق ہو جاتا۔

خدا خدا کرکے وہ دن بھی آگیا کہ میں مدرسے میں شریک ہونے کو گیا۔ مدرسے کی عمارت دیکھتے ہی میرے دل پر ایک پر اسرار عظمت طاری ہو گئی۔ اندر کے محراب مجھے بڑے شاندار معلوم ہونے لگے اور میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا کہ میں بھی اب اس میں پڑھنے لگونگا۔ میں نے ایک ہال دیکھا جس میں سیکلیں کھچا کھچ بھری ہوی تھیں...... "اف" میں نے کہا...... "کتنے لڑکے آتے ہیں یہاں!"

بہر حال میں مدرسے کو آنے جانے لگا۔ ایک چھوٹی سی سیکل مجھے دلا دی گئی۔ اس زمانے میں میرا

محبوب ترین مشغلہ مدرسہ جانا تھا۔ میں جماعت میں بہت خاموش رہتا تھا۔ ابھی میری کسی سے دوستی نہیں ہوئی تھی، مجھے میرے ساتھ کے لڑکے کی سیماب وشی ابھی تک یاد ہے اب یہاں، اور ابھی سامنے کی نشست پر........ اس کو گدگدایا اور اُس کو جالیا۔ میرے سامنے اس کو کئی دفعہ سزا ملتی تھی۔ مگر اسکی بے چینیوں کو قرار نہیں تھا۔ مجھے اس کی حرکتیں بڑی دلچسپ معلوم ہوتی تھیں۔ میں اسکی ہر بات پر ہنس دیتا تھا۔ رفتہ رفتہ ہم دونوں کی دوستی ہوگئی۔ اسکی ابتدا کیسے ہوئی تھی میں نہیں بتلا سکتا۔

تاریخ جغرافیہ انگریزی میں پڑھنا ذرا دقت طلب امر تھا۔ نہ مدرس صاحب ہم کو سمجھا سکتے تھے اور نہ ہم سمجھ سکتے تھے۔ آخر انہوں نے نوٹس لکھا دیئے اور زبانی یاد کرنے کا حکم دیا۔ جو یاد نہ کرتا اُسے سزا ملتی، انہیں اس سے غرض نہ تھی کہ سمجھ کر بھی یاد کیا ہے یا نہیں۔ اور بات اصل تو یہ ہے کہ وہ بیچارے مجبور بھی تھے۔ لڑکوں کے کامیاب ہونے کے وہ ذمہ دار تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طریقے سے لڑکوں کی ایک بڑی تعداد کامیاب ہو جائے، اور ایسا ہی ہوتا۔ بھلا زبانی حفظ کر لینے کے بعد فیل ہونا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ اور بات ہے کہ ذہین طلبہ کا اس سے نقصان ہوتا ہو۔ مگر امتحان کا طریقہ قابلیت جانچنے کا صحیح آلہ کب ہے؟....... بہرحال امتحان ہوا اور ہم بغیر کسی سفارش کے کامیاب ہو گئے۔ آگے چلکر ہم کو معلوم ہوا کہ اس مدرسہ میں کسی کا انگریزی میں کامیاب ہو جانا سب سے بڑی سفارش ہے اس علم کے بعد میں نے ہمیشہ صرف انگریزی میں اچھے نشانات حاصل کر کے ترقی پائی ہے۔

دوسری جماعت کے اساتذہ میں مجھے وہ صاحب یاد ہیں جو اردو پڑھاتے تھے (خدا مغفرت کرے) میں نے اُن کے "تھپڑ" بھولے نہیں ہیں۔ میں نے بارہا دعائیں کی تھیں کہ "الٰہی آج کچھ ایسی افتاد پڑے کہ وہ نہ آسکیں" مگر وہ آتے تھے اور بڑی پابندی سے آتے تھے۔ وہ جب جماعت میں رہتے تو بس خاموشی ہی خاموشی رہتی اور کوئی باہر کا شخص کبھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس کمرے میں چالیس پچاس "اخوان الشیاطین" بیٹھے ہیں۔

فارسی کا گھنٹہ آخری تھا، اور اس میں ہم کو چھٹی ہو جاتی تھی، مولوی صاحب شاید بہت مصروف تھے

یا لڑکوں سے انہیں بہت ہمدردی تھی کہ "دن بھر سر کھپاتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔۔آرام بھی لینے دو۔۔۔۔۔۔ کیا یاد کرینگے"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور واقعی آج ہم انہیں یاد کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔بڑے نیکدل اور اچھے تھے بیچارے!۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اب ہم مڈل میں آ گئے، اب ہماری جماعت کو ذرا، اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ ہم کو سرکاری امتحان دینا تھا۔ اس کے لئے ہم کو بڑے زور و شور سے تیار کرایا گیا تھا۔ یہاں ایک مدرس صاحب تھے۔ انہوں نے سزا دینے کا ایک عجیب طریقہ نکالا تھا۔ لڑکے کی دو انگلیوں کے بیچ میں پنسل رکھتے (جیسے سگار پکڑتے ہیں) اور اوپر سے دباتے یقین جانئے کہ تلملا کر رہ جانے میں مزہ آ جاتا۔ اگر بار خاطر نہ ہو تو کچھ دیر کے لئے آپ بھی تجربہ فرما لیجئے۔ مجھے اس زمانے کا ایک واقعہ یاد ہے اور شاید مدت العمر یاد رہے گا۔ مدرسے میں پہلی مرتبہ (اور شاید آخری) ایک تقریری مقابلہ ہوا تھا۔ مڈل کی نمائندگی چار لڑکے کر رہے تھے جن میں سب سے چھوٹا میں تھا "گریٹ ہال" کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہلتی ہوی گردنوں کی لہروں اور آوازوں کی بھنبھناتی ہوئی گونج کے درمیان میں اسٹیج پر گیا۔ سب حیران تھے کہ میں کیا تقریر کر سکونگا۔ میں نے آواز پر قابو حاصل کیا اور تقریر شروع کی۔ میرے اس زمانے کے ملنے والے دوست احباب کہتے ہیں کہ میں نے بہت اچھی تقریر کی تھی صدر صاحبان نے بڑی تعریف کی اور میرے متعلق بہت سے توقعات ظاہر کئے میرے اول آنے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد ہماری جماعت کے لڑکوں نے مجھے کندھوں پر اوٹھا لیا اور بڑی دیر تک گشت کرایا۔ میرا دل ناقابل بیان مسرت سے معمور ہو گیا میں نے سینما میں ایک بڑے آدمی کو اسی طرح گشت کرتے دیکھا تھا۔ میری طرف انگلیاں اٹھتی تھیں کہ اسی لڑکے نے تقریر کی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مڈل کے بعد کی جماعت میں حساب کے گھنٹے سے مجھے بڑی دلچسپی تھی۔ ان کا طمانچہ (الیٹر سے ذرا کم درجے کا) اور ان کا وہ جملہ جن سے وہ لڑکوں کو (اور بعض اوقات اپنے ہم جلیسوں کو بھی) مخاطب کرتے ہیں بڑا دلچسپ ہے، اور طالب علموں کی دنیا میں خاصا مشہور ہے۔ ان سے مار کھانے میں لڑکوں کو بڑا لطف آتا تھا، شاید انہیں مارنے میں بھی آتا ہوگا۔ جماعت میں جب کبھی موقع ملتا وہ نصیحتیں کرتے تھے۔

چنے انہیں بہت مرغوب تھے اور راستے سے چلتے ہوئے، چنوں سے شغل فرماتے تھے۔ سیکل پر بیٹھنے کے بہت مخالف تھے مگر سنا ہے کہ اب خود ایک سیکل خرید لی ہے (ایک بار امتحان کے موقع پر انہوں نے مجھ سے "نیکی" کی تھی، مگر یہ راز کی بات ہے، قوسین میں ہی رہنے دیجئے)

میں نے ڈرائنگ کی جماعت میں بہت سی سزائیں بھگتی ہیں۔ اکثر اوقات اس خیال سے کہ مولوی صاحب جماعت میں نہیں ہیں بے تکلفی برت جاتا۔ بات یہ تھی کہ ڈرائنگ کے مولوی صاحب ذرا مختصر سے آدمی تھے، اور جب وہ لڑکوں کے ساتھ رہتے تو ان کو پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ ...... اس طرح میں کئی بار غلط فہمیوں کا شکار ہوا تھا۔

ایک اور "مختصر" بزرگ کچھ دنوں تک انگریزی پڑھاتے تھے ان سے اُردو بولنے میں لڑکوں کو بڑا لطف آتا تھا۔ جب وہ انگریزی میں سوال کرتے اور جواب میں کوئی لڑکا اردو میں تقریر شروع کر دیتا تو انکی حیرانیاں دیکھنے سے تعلق رکھتیں۔ لڑکے انکی موجودگی کو کلاس میں اس طرح نظر انداز کر دیتے گویا وہ ہیں ہی نہیں، اور ایسی شرارتیں کر بیٹھتے کہ الاماں۔ کسی گزشتہ موقع پر ایک صاحب نے اپنی ایک مشہور تقریر میں فرمایا تھا، کہ صدر مدرس کو ایورسٹ کی طرح طویل ہونا چاہئے ...... ("طویل" "احمق" کو بھول جائیے) شاید اس میں یہی فلسفہ مضمر تھا، کہ مدرس یا صدر مدرس اپنی طوالت سے لڑکوں کے دلوں میں اپنی سربلندی کا احساس پیدا کر سکے۔

ہمارے زمانے میں اسکول فائنل کے امتحان میں تاریخ جغرافیہ کا پرچہ لازمی نہیں تھا۔ صرف مدرسے میں اسکی تعلیم دی جاتی اور ریکارڈ بک میں نشانات درج کر دیئے جاتے تھے اور اسی وجہ سے ہمارے سارے ساتھی تاریخ جغرافیہ پڑھنے کی ضرورت سے بے نیاز نظر آتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار تاریخ کے پرچوں میں ہم نے بالاتفاق بڑی گلکاریاں کی تھیں، ملک کافور کے متعلق لکھا تھا کہ نورجہاں کا باپ تھا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں ہندوستان آیا اور اس کے بعد تخت نشین ہوا۔ ...... یادش بخیر تاریخ کے امتحان کے سلسلہ میں مجھے اپنا نباتیات کا امتحان بھی یاد آرہا ہے۔ مگر پہلے ذرا آپ تفصیل سن لیجئے

میں نے کن حالات کے تحت نباتیات کا مضمون اختیار کیا تھا۔ دراصل میرا مضمون اختیاری ریاضی تھا۔ اور ریاضی والے بزرگوار سے میری چھیڑ چلی آتی تھی "وصل" سے میں ناامید ہو چلا تھا اور "حسرت ہی حسرت" کے مصداق ان سے الجھ جاتا تھا۔ مجھے انکی یہ بات بہت ناپسند تھی کہ وہ جیومٹری کے مسئلے حفظ کرلینے پر مجبور کرتے تھے انکی منطق تھی کہ لڑکے صحیح انگریزی لکھ نہیں سکتے اس لئے انکو کتاب کی انگریزی رٹ لینی چاہئے اور یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا تھا۔ یہی وجہ ہماری مخالفت کی تھی میں نے تنگ آکر ان کی جماعت کو جانا چھوڑ دیا مگر اس طرح میں ریاضی میں کامیاب بھی تو نہیں ہوسکتا تھا۔ دوسرا شعبہ نباتیات کا تھا نباتیات کے لکچرار صاحب کے ہونٹوں پر ہمیشہ ایک پُرلطف تبسم رقصاں رہتا تھا اور طبیعت بس یہی چاہتی تھی کہ ان سے ہمیشہ باتیں کیا کیجئے۔ مجھے نباتیات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی مگر لکچرار صاحب سے البتہ دلچسپی ضرور تھی اور یہی وجہ مضمون تبدیل کرنے کی بھی ہوئی۔ میرے لئے یہ مضمون نیا تھا۔ میرے ساتھیوں نے کورس کا بڑا حصہ ختم کرلیا تھا، اس لئے لکچرار صاحب نے مدرسے کے اوقات کے علاوہ بھی پڑھانے کا وعدہ فرمایا، مگر افسوس ہے میں انکی اس مہربانی سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ امتحان آگیا اور میں مضمون سے جوں کا توں ناواقف تھا۔ ایک سوال "پتوں" پر آیا تھا۔ میں نے خالی پرچہ دینے سے بہتر یہ جانا کہ کچھ نہ کچھ لکھوں۔ سعدی کے "برگ درختان سبز" سے ابتدا کی۔ ایک بہت بڑا مضمون لکھا اور ثابت کیا کہ بہار پتوں ہی سے ہے۔ ورنہ غالب کو "ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے" لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آتی۔ شاید میرا پرچہ نباتیات کے شعبے میں اب تک محفوظ رکھا ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو جاکر ملاحظہ فرمالیجئے۔

نباتیات کے سلسلے میں ایک تعلیمی تفریح کی یاد میرے دل سے محو نہیں ہوسکتی۔ عثمان ساگر کے چمن میں لکچرار صاحب اور لڑکے پھول پتوں کے تجربے کرنے اور ان کے نقشے اتارنے میں مصروف تھے اور میں ایک طرف علیحدہ بیٹھا ہوا غمناک سروں میں گنگنا رہا تھا کہ "نہیں منظور مغز سر کا اماس"

اسی زمانے میں ہم نے ایک ہڑتال کی تھی۔ سکندرآباد کے جو قومی کرکٹ کے کھیل ہو رہے تھے مگر مدرسے کے اوقات میں کوئی تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ اسی زمانے میں لاہور کے کسی کالج کی ہڑتال کی خبریں

شایع ہو رہی تھیں۔ ہم نے باقاعدہ طور پر جو کسی اور ناکہ بندی کی اور پوری کلاس کو لے کر (دو صاحبین کو چھوڑ کر) رفوچکر ہو گئے۔ دوسرے دن مدرسے کے سامنے سب جمع ہوئے ندی میں پانی زیادہ آ رہا تھا ہم سب تماشہ دیکھتے کھڑے تھے کہ مدرسہ کے اسٹاف کے ایک رکن نے آ کر بہت ہی قانونی انداز میں ہم سے کہا کہ ہمارے مطالبات پورے کر دیئے جائیں گے اور جماعت میں چلنے پر مجبور کیا ہم لوگ اس دھوکے میں آگئے اور جماعت میں جا چلے گئے۔

اس کے بعد پرنسپل صاحب نے ایک تقریر کی اور ثابت کیا کہ ہماری حرکت بڑی نازیبا تھی اس کے بعد ہم کو سزائیں دی گئیں کیا سزائیں تھیں؟...... میں نہیں کہہ سکتا۔ شاید میرے احباب کو جو اسوقت شریک جرم تھے اچھی طرح یاد ہو گا۔

میں سکستھ فارم میں تھا۔ نباتات میں کامیاب ہونا ذرا مشکل امر تھا۔ امتحان کو صرف دو مہینے رہ گئے تھے۔ میں نے بلا سوچے سمجھے ایک درخواست دے ڈالی کہ میں اردو فارسی پڑھنا چاہتا ہوں۔ ضروری کارروائی کے بعد درخواست منظور ہو گئی۔ اور میں دست غیب کی امداد کے بھروسے پر امتحان میں شریک ہو گیا۔ غیبی امداد ہی ملی ہو گی۔ جو میں اردو اور فارسی میں کامیاب ہو گیا ورنہ توقع کسے تھی

اب مجھے مدرسہ چھوڑے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا ہے مگر اب بھی جب مدرسے کے سامنے سے گذرتا ہوں تو اس کے پر عظمت محراب، خزاں رسیدہ چمن، اور لڑکوں کا مدہم شور سب ملکر ایک رومانی کیفیت پیش کرتے ہیں۔ اور میں بے ساختہ پکار اٹھتا ہوں کہ

اے عہد رفتہ تیری کیوں یاد آ رہی ہے



مدرسے کے دن

از

مولوی ناصر الدین احمد صدیقی صاحب بی اے ایچ سی ایس
پروبیشنر

سٹی کالج سے جس قدر اسکے فرزندوں کو محبت ہے وہ ظاہر ہے۔ اس سے متعلق کوئی کام کوئی بات ہو تو وہ اپنے اس گہرے تعلق کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے جو اس مادر علمیہ سے ہے۔

سٹی کالج کی دلچسپیوں اور خصوصیات کے متعلق مضمون تو کیا رسالہ تیار ہو جائے اور پھر بھی بیان ختم نہ ہو۔ بعض لوگوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ سٹی کالج کے انتخاب کرنے کی کیا وجہ ہوئی کوئی اور ادارہ کیوں پسند نہیں آیا؟ پسندیدگی ہمیشہ نفسیات (سائیکولجی) سے متعلق رہی ہے۔ ایک چیز کو آپ پہلی نظر میں پسند کرنے لگتے ہیں اور کوئی وجہ نہیں بتا سکتے۔ دوسری چیز کو پہلی نظر میں ناپسند کرتے ہیں اور خود اس کا سبب نہیں جانتے۔ غرض اتفاق اور حسن اتفاق تھا کہ ہم میٹرک کے لئے سٹی کالج میں شریک ہو گئے۔

پری میٹرک کی جماعت تھی۔ امتحان کا کوئی ڈر نہ تھا۔ کلاس میں برابر حاضر رہتے مگر دماغ غیر حاضر۔ دوست بھی بے فکرے ملے تھے خوب گزرتی تھی۔

اسکوٹنگ ان دنوں ترقی پر تھی۔ خود سٹی کالج میں سات مختلف ٹروپ تھے ہم بھی ایک گروہ میں شریک ہو گئے۔ کالج کے اوقات میں کلاسوں کے اطراف چکر مارنا۔ نئے لڑکوں کو پریشان کرنا۔ استادوں کو

دق کرنا ہمارا کام تھا۔ اور اسکوٹنگ نے بقیہ وقت لے لیا۔ ہم بہت جلد اپنی ٹروپ کے لیڈر بن گئے کیمپ الگ کرتے کھیل کود میں دن گزارتے۔ جب بنجارہ ہل پر سوائے مولوی عبدالحق صاحب کے کوئی نہ رہتا تھا۔ ہم لوگوں نے بڑا اسکوٹ کیمپ کیا۔ دور دور سے لوگ آئے۔ مہاراجہ بہادر بھی تشریف لائے کیمپ دیکھا خوش ہوئے ہمیں باڈرلیس ڈیوٹی پر دیکھکر اظہار مسرت کیا۔ ڈسمبر ۱۹۲۷ء میں سٹی کالج ٹروپس کے ساتھ اسکوٹس اجتماع میں شرکت کیلئے بمبئی گئے سیر کی ایک ہفتہ رہکر واپس ہوئے۔ واپسی کے بعد ہی سالانہ امتحان ہوا ٹیرک کی جماعت میں ترقی ملی۔ ایک دو سال کے بعد اسکوٹنگ کا زوال شروع ہونے والا تھا۔ حیدرآباد میں اسے وہ ہر دلعزیزی حاصل نہ رہی جو پہلے تھی۔ اسکوٹ ماسٹروں کے آپس کے جھگڑے اور رقابت کے علاوہ خالص اسکوٹ تعلیم کا فقدان تھا۔ اسپرٹ کے ساتھ ساتھ اسکوٹ کی تعداد میں بھی کمی ہونے لگی ہم نے اس کا اندازہ لگا کر اپنی توجہ کم کردی۔ ساری توجہ اب جماعت کی طرف تھی جس کا مختصر حال سناتے ہیں۔

جغرافیہ کی جماعت بہت خشک ہوتی۔ ہم اپنے اور چند دوستوں کی حد تک کوئی شغلہ نکال ہی لیتے تاکہ وقت آسانی سے کٹے دوسرے ہم جماعتوں کی یہ حالت کہ کوئی اونگھ رہا ہے، کوئی سر پکڑے بیٹھا ہے ہمارے استاد بلا کسی طرف توجہ کئے اپنے لکچر میں دھیان رکھتے۔ بڑے زاہد خشک تھے۔ کسی نے انکو مسکراتے نہ دیکھا۔ بھلا ایسی کلاس میں وقت یوں ہی تھوڑا ہی کٹ سکتا ہے۔ نیک اس قدر تھے کہ کسی لڑکے کو تلقین فرماتے تو پہلے خود نیچی نظریں کرلیتے اور پسینہ پسینہ ہوجاتے۔ اگر کسی لڑکے کی بدتمیزی یا گستاخی پر غصہ آگیا (اور غصہ کم آتا تھا) تو انگریزی میں بات کرنے لگتے۔ غیر زبان کے ذریعے اپنی زبان کی روک ہوجاتی کہ خواہ مخواہ غصہ میں کچھ کہہ بیٹھیں۔ اور ادھر لڑکے پر انگریزی کا بڑا رعب پڑتا تھا۔ غرض بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔

انتخابی امتحان ہوچکا تھا۔ نتیجہ کا انتظار تھا۔ انہوں نے سبھوں کے متعلق اپنی قیمتی رائے ظاہر فرمائی۔ کلاس میں ایک صاحب تھے جن کو لوگ "نواب" "نواب" پکارتے اور گالیاں سنتے تھے۔ یہ "نواب صاحب" بڑے بگڑے دل تھے۔ زیادہ محنت کرنے کا دماغ پر جو اثر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے۔ ہمارے

ایک دوست نے انہیں مشورہ دیا کہ اگر خدانخواستہ آپ امتحان سے روک دیئے جائیں تو مسلم جنگ کے پل پر کھڑے ہوکر پرنسپل صاحب کو بلا کر کہئے کہ ہم کو اب بھی بھیجتے ہیں کہ نہیں ورنہ ہم کود پڑتے ہیں۔ انہوں نے اگر بھیجدیا تو اچھا ہے کام نکل جائے گا اور اگر وہ اڑے رہے اور کہا کہ ہم نہیں بھیجتے تو آپ بھی اتر آئے اور کہئے کہ پھر ہم بھی نہیں کودتے۔ جب اس کلاس میں "نواب" کی باری آئی تو ہمارے دوست نے کہا کہ "نواب صاحب نے ارادہ کرلیا ہے کہ امتحان میں بھیجے نہ جائیں تو خودکشی کریں گے" مولوی صاحب بڑے نیکدل خداترس تھے۔ انہوں نے لکچر دینا شروع کردیا کہ خودکشی گناہ کبیرہ ہے اور دنیا امتحان گاہ ہے وغیرہ۔ جو مولوی صاحب جغرافیہ کی کلاس میں ایک منٹ باتوں میں ضائع ہونے دیتے تھے اسوقت انہوں نے پورا ایک گھنٹہ "اس کار خیر" میں صرف کردیا۔ جب مولوی صاحب کہتے کہتے تھک گئے تو ہمارے دوست نے اپنا مشورہ ان کے سامنے دھرایا۔ مولوی صاحب کو کسی نے اس قدر ہنستے نہ دیکھا تھا گویا کہ گذشتہ اور آیندہ کی اکٹھی ہنسی ختم کردی۔ کمیٹی میں مولوی صاحب نے "نواب" کی طرفداری کی اور خودکشی کا معاملہ بیان کیا۔ وہ امتحان میں بھیجدیئے گئے مگر کامیاب نہ ہوسکے۔ یہ انکی قسمت!!

ایک اور ٹیچر تھے۔ نئے نئے آئے اور سختی شروع کردی۔ ہمنے بھی مزاحمت کی مقاومت کی بیچارے کو سخت تنگ کیا۔ وہ ہم سے سخت بیزار تھے اور ہمیشہ برسرپیکار۔ لوگوں سے شکایت کی۔ پرنسپل کو الگ بدظن کیا۔ جب کچھ نہ ہوا تو ہماری غیرحاضریوں کو حاضری بنادیا۔ اس طرح ہمیں منا سمجھا کر کلاس سے چلا دیتے کہ دوسروں کو کچھ پڑھا سکیں۔ ان کا لب و لہجہ ابتک یاد ہے۔ نہایت کرخت، جہاں کسی نے زبان کھولی کہ آپنے پکارنا شروع کیا "باتیں" "باتیں مت کرو" لڑکے پیچھے کی بنچوں پر بیٹھے اُن کی نقل کرتے۔ ان مولوی صاحب نے شادی رچائی ہم سے اتنا چھپایا کہ ایک کو بھی دعوت نہ دی۔ ہم کو بعد از وقت خبر ہوئی ہمنے بھی ایک تدبیر کی دو پائی فی طالب علم ٹیکس لازم کردیا۔ چندہ جمع ہوگیا۔ ایک لڑکے کو پھول کا ہار لانے بھیجا۔ لڑکا تھا ہوشیار اس نے ایک پرانی چنگیر لی جو قدامت کے سبب سفید سے سیاہ ہوگئی تھی۔ اس میں ایک ہار رکھا اور عین اسوقت داخل ہوا جب مولوی صاحب کو لڑکوں کی طرف سے مبارک سلامت ہورہی تھی۔ پہلے ہی پریشان تھے اس

چنگیر کو دیکھا تو اور پریشان ہوئے خدا جانے کیا سمجھا۔

ہمنے کھڑے ہو کر کہا کہ "مولوی صاحب نے اس خوشی کے موقع پر ہم کو فراموش کر دیا۔ یہ آپکا فعل تھا آپ ذمہ دار ہیں۔ اب ہم سے رہا نہیں جاسکتا۔ یہ ہے ہمارے خلوص کا اظہار"........ ہار پہنا دیا۔ مولوی صاحب بہتیرا ہاں ہاں کرتے رہے۔

ہمارے ایک مولوی صاحب بلکہ مولنا کا حال سنئے۔ علم و فضل میں کس کو کلام۔ تحریریں وہ زورکہ مخالف ہمخیال ہو جائے اور موافق خوشی سے نہال ہو جائے تقریریں بوالکلام مگر نیازمندی لئے ہوئے۔ بات کرتے تو خاص انداز سے کوئی تذکرہ کرتے تو دل تھام تھام لیتے۔ حکمت سے ذوق تھا اور معجون اور دواؤں کا خاص شوق تھا۔ ہمیشہ شاگردوں کو فوائد سے آگاہ کرتے اور مقویات کے بارے میں زرین خیالات کا اظہار فرماتے مولنا کی ڈبیہ میں سپیاری کا مغز، کھوپرا، جوز، جوتری، لونگ الائچی بھری رہتی۔ خود شوق فرماتے۔ ہماری تواضع کرتے تب کہیں لکچر شروع ہوتا۔ ان کا معمول تھا کہ ہفتہ میں دو دن کلاس لیتے اور بقیہ دن چین کرتے کسی دن ہم نے شکایت کی کہ مولنا تشریف نہیں لائے! انتظار کرایا اطلاع تو دیدی ہوتی۔ تو آپنے خاص انداز میں فرمایا "کیا عرض کریں مولنا صاحب ہم نکلنے ہی کو تھے کہ سر میں اس شدت کا درد ہوا کہ سر پکڑ کر بیٹھ رہے ڈرتے ہیں بے احتیاطی کی تو بخار آجائے اور خدا جانے کیا ہوجائے۔ کوئی عزیز قریب نہیں۔ غریب الوطنی ہے"!!

غرض مولنا اپنی غیر حاضری کیلئے کوئی نہ کوئی سبب سوچ رکھتے۔ برسات کا موسم تو قیامت تھا۔ سردی غیر بازاز میں رہتے بارش ہوئی اور سڑکیں دونوں خراب۔ آئیں تو کیسے، کیچڑ اڑے تو دلی کا زرین جوتہ خراب ہو جائے سیکل پھسل جائے تو گر پڑیں اور چوٹ آئے اسکو "آسمانی" سمجھکر اطمینان سے بیٹھ رہتے اور یہاں ہمارے اسباق ناغہ۔ کورس بہت تھا اور امتحان میٹرک قریب۔ مولنا کی دعا کہئے یا ہماری محنت کورس ختم ہو گیا۔ اور ہم بھی کامیاب۔

"مولویوں" کی دنیا میں کبھی کمی نہ تھی اور اب تو "مولوی" نام جزو لاینفک ہے دوسرے مولوی صاحب کا حال سنائیں وہ دراصل مسٹر تھے ریاضی داں پٹھان۔ کریلا نیم چڑھا۔ نئے نئے استاد بنے تھے اور دھن منفرم

ہمارا اُستا بننا مذاق نہ تھا۔ ریاضی ہماری کمزور سہی اور کمزور سب کی ہوتی ہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ جب ہم توجہ کے ساتھ بیٹھتے تو بعض اچھے لڑکے بھی پیچھے رہ جاتے۔ کل کے طالب علم آج خود کو اُستاد سمجھکر اینٹھنے لگے۔ غرض ہم سے خوب نوک جھوک رہتی ہم شرارت سے اُن کو غصہ دلاتے خود مسکراتے اور ان کا مذاق اڑاتے۔ وہ ہیں کہ غصے میں بھرے کہنا کچھ ہوتا کچھ کہہ جاتے۔ ہوم ورک پر اکثر اُن سے جھڑپ ہوتی۔ ہم نے سب لڑکوں کو راضی کر لیا کہ ہوم ورک نہ بتائیں ....

گرما کا زمانہ، صبح کا مدرسہ خود ایک اُبال جان تھا۔ تین بجے ان کی ریاضی کی کلاس ہوتی ہم مقام واردات پر موجود رہتے۔ لڑکوں کو بہکاتے۔ بیڈمنٹن کا نٹ تیار۔ فنگر بلیرڈ حاضر جس کا جی چاہے شوق کرے مگر اوپر نہ جائے۔ مولوی صاحب اوپر منتظر ہم نیچے مصروف۔ غرض روزانہ کے یہی قصے تھے۔

ہم میٹرک میں کامیاب ہوئے اور خوب کامیاب ہوئے بعض خوش ہوئے اور بعض ناخوش مگر سبھوں نے مسرت کا اظہار کیا۔ ہمارے ریاضی کے اُستاد ایسے بردا شتہ خاطر ہوئے کہ سات سمندر پار چلے گئے۔ ہم کہا سنا بھی معاف نہ کرا سکے۔ معلوم نہیں وہ آتے بھی ہیں یا نہیں۔

غزل

از قدسی صدیقی

حیف عمرم ہمہ در حرص و ہوا گشت تلف
روز و شب در طلب برگ و نوا گشت تلف

دل بہ بیت او کرد فراموش چناں
عہد روز ازلی حیف ز ما گشت تلف

جلوہ ہوش ربائے سر بزمے دیدیم
طاقت صبر و سکوں از دل ما گشت تلف

نہ شد آں سرو قدم رام بقول غالب
گل و شمع بہ مزار شہدا گشت تلف

الم و رنج نہ شد دور ز دل وائے نصیب
عمر قدسی بہ دعا و بہ دوا گشت تلف

سٹی کالج کی تربیت

از

مُدیر

ہر اعلیٰ درجے کی درسگاہ کا سب سے اہم مقصد یہی ہوتا ہے کہ اوسکے جملہ طالب علموں میں ایک مخصوص تربیت پیدا ہو۔ اسکے تمام فیض یافتہ خواہ وہ عملی دنیا میں اپنے پیشوں، طبقوں اور حیثیتوں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے کتنا ہی بعد اور اختلاف کیوں نہ رکھتے ہوں ایک خاص تربیت اور خاص خیالات و معتقدات کے حامل ہوں اور اپنے خیالات او رعمل سے فوراً پہچان لئے جاسکیں کہ یہ فلاں درسگاہ کے طالب علم ہیں۔ جب تک اس قسم کی ہم آہنگی اور خاص تربیت سٹی کالج کے جملہ طلبہ میں بھی نہ پیدا ہو سکے گی۔ ہم بہت کم اپنی درسگاہ کے اور خود اپنے، وقار میں اضافہ کرسکیں گے۔ اور وقار میں اضافہ کرنا تو کجا ہماری منتشر، بے ڈول اور غیر ہم آہنگ قوتیں نہ صرف ہماری درسگاہ کو بلکہ ہمیں بھی خاطر خواہ مستفید نہ کرسکیں گی۔

ممکن ہے کہ تھوڑی سی غیر محسوس ہم آہنگی اور یگانگت اب بھی سٹی کالج کے جملہ فیض یافتوں کے آپس میں پائی جاتی ہو۔ لیکن یہ ناکافی ہے۔ اور ضرورت ہے کہ اس عظیم الشان درسگاہ کی دیرینہ تاریخ اور روایات کو ملحوظ رکھکر ایک مخصوص شائستگی او رتربیت کے لوازمات و اجزا پر غور و خوض کیا جائے، اور انہیں متعین کر دینے کے بعد انہی کے مطابق ہم اپنی تحریر و تقریر سے کام لیں۔ ہمارے سالناموں کے مضامین ایسے ہی

ہوں جو اس خاص تربیت کے پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوں اور غیر محسوس طرح سے انکی اشاعت کریں ہماری گفتگو اور تقریروں کے موضوع بھی زیادہ تر اسی تربیت او ہم آہنگی سے متعلق ہوں اور جلد سے جلد قدیم و موجودہ طلبہ کے ذہن نشین کر سکیں کہ سٹی کالج کے طالب علم کن روایات کے حامل اور کس تربیت سے مالامال ہوتے ہیں

حیدرآباد کی سب سے بڑی اور سب سے بہتر انگریزی درسگاہ ہونے کی حیثیت سے سٹی کالج نہایت ہی شاندار روایات کا مالک ہے اور یہ روایتیں یہاں کے طلبہ کے نہ صرف تعلیمی امتیازات اور کامگاریوں پر مشتمل ہیں بلکہ تفریحی اور کھیل کود کی بازیوں کی فتحمندیاں بھی ان میں برابر کی حصہ دار ہیں ایسی گوناگوں اعلیٰ روایات بہت کم درسگاہوں کو حاصل ہوتی ہیں لیکن انہیں برقرار رکھنے اور ان میں اضافہ کرنے کیلئے ضروری ہے کہ موجودہ طلبہ کو ان سے واقف رکھا جائے اور ان کی ہمت افزائی کے وسائل اختیار کئے جائیں تاکہ وہ اپنی درسگاہ کے نہ صرف پر عظمت ماضی پر افتخار محسوس کرتے رہیں بلکہ اس کی عظمتوں میں اضافہ کرنے کے قابل بھی بن سکیں۔

سٹی کالج کے ہر طالب علم کو جن معتقدات کا گرویدہ ہونا چاہیئے ان کا یا اس کو اپنی درسگاہ سے جس رنگ میں رنگا ہوا نکلنا چاہئے اس کا تعین کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ غور و خوض کے سلسلہ میں بہت سی خصوصیتیں ایسی ملیں گی جو ہر مدرسے کے طالب علم میں ہونی چاہئیں، اور یہ اعتراض پیدا ہوگا کہ ہم انکے بل بوتے پر کیسے ایک مخصوص تربیت کا دعویٰ یا تبلیغ کر سکتے ہیں؟ لیکن یہ خیال کوئی اہمیت نہیں رکھتا اگر ہم اس امر پر غور کریں کہ جو خصوصیتیں تمام مدارس کے طلبہ کے لئے ضروری ہیں انکو ان تمام مدارس میں سے اگر صرف ایک ہی مدرسہ کے زیادہ سے زیادہ طلبہ عملی جامہ پہناتے ہیں تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ وہ مدرسہ اور اس کے طلبہ اپنی تربیت کے لحاظ سے سبھوں میں خصوصیت رکھتے ہیں۔

مگر ہمیں اتنا بھی نا امید نہیں ہونا چاہیئے۔ ان عام خصوصیات اور معتقدات کے علاوہ چند ایسے امور بھی ہیں جو محض ہماری درسگاہ اور اس کے طلبہ کے ساتھ مخصوص ہیں یا مخصوص کرلئے جا سکتے ہیں مثال کے طور پر ہم ایک دو کا ذکر کریں گے جو معمولی اور سرسری غور و فکر کا نتیجہ ہیں اور بہت ممکن ہے کہ اگر اجتماعی طور پر

ان کی نسبت کافی غور کیا جائے تو اور کئی ایسے امور پیش نظر ہو جائیں گے جو سٹی کالج اور اُس کے طلبہ کو حیدرآباد کے دیگر مدارس اور اُن کے طلبہ سے ممتاز کرتے ہیں۔

جملہ مدارس کے طالب علموں کو مدرسہ سے نکلتے وقت جو خیالات اور معتقدات اپنے ساتھ لیکر نکلنا چاہئے اُن میں سب سے زیادہ اہم ہیں : ۔ درسگاہ کی بہبودی، استحکام اور وقار کے اضافہ کا خیال۔ (۲) ملک و مالک کی خدمت اور وفاداری کا احساس (۳) کردار کی نگہداشت (۴) تمام قدیم و جدید طلبہ کے آپس میں مواخواۃ کا قیام۔

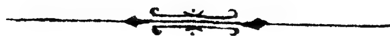
اگر صرف انہی متذکرہ امور پر ہماری درسگاہ کے سب فیض یافتہ پابندی کے ساتھ عمل پیرا ہوں تو یہ کوئی کم امتیاز نہیں ہے۔ مگر ان کے علاوہ بھی بعض خصوصیتیں ہمارے قدیم طلبہ کا طرۂ امتیاز بن سکتی ہیں مثلاً حیدرآباد کی سماجی و مدنی زندگی کی اصلاح و بہبود پر غور و خوض کرنا اور عملی طور پر حصہ لینا۔ یہی ایک مقصد اتنا اہم اور قابل توجہ ہے کہ ہمارے جملہ طلبہ قدیم اپنی پوری قوتوں کے ساتھ اسکی تکمیل کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں؛ اور اگر اس کوشش میں وہ ذرا بھی کامیابی حاصل کرلیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ حیدرآباد کے شہریوں میں اُنہیں مخصوص حیثیت حاصل ہوگئی اور انکی درسگاہ کی خاص تربیت کا ظہور اور اسکی روایات میں اضافہ ہوگیا۔

سٹی کالج کے قدیم و جدید طلبہ میں ایک خاص ہم آہنگی اور یگانگت پیدا کرنے کے لئے اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ چند طلبۂ قدیم اور چند عہدہ داران مدرسہ کی ایک ذیلی کمیٹی کے ذریعہ سے مدرسہ کا کوئی خاص رنگ یا لباس مقرر کردیا جائے اور تمام غیر معمولی موقعوں پر جملہ طلبہ اس رنگ یا لباس کے بغیر نظر نہ آئیں۔ مدرسہ کے جملہ موجودہ طلبہ کے لئے بھی یہ لباس یا رنگ لازمی قرار دیا جائے اور اگر روز نہیں تو ہفتہ میں کوئی ایک دن ایسا مقرر ہو جب کہ یہ سب طلبہ اپنے مدرسہ کے امتیازی رنگ یا لباس میں مدرسہ آئیں۔ اس ایک روز کی پابندی کی وجہ سے وہ اس لباس یا رنگ کی تیاری کے لئے مجبور ہو جائیں گے، اور آہستہ آہستہ اُن میں ایک طرح کی یگانگت اور ہم آہنگی کا خیال پیدا ہوتا جائے گا۔

اس ہم آہنگی اور یگانگت کے ذہن نشین کرنے کے لئے اس انتظام کی بھی ضرورت ہے کہ ہر ہفتہ میں ایک

ایک دن ایسا مقرر کیا جائے کہ ایک قدیم طالب علم سٹی کالج کے اقامت خانہ میں (اپنے صرفہ سے) طلبہ کے ساتھ ہم طعام ہو۔ اور اس طرح ان نونہالوں کو ہر ہفتہ ایک نئے پیشرو سے تبادلۂ خیالات کرنے، اور معلومات میں اضافہ کرنے کا موقع ملے گا۔ اور اُدھر ہر ہم طعام ہونے والا قدیم طالب علم بھی اس امر کی کوشش کرے گا کہ اپنی بے تکلف گفتگو سے اپنی عظیم الشان درسگاہ کے دیرینہ روایات اور اعلےٰ معیار کردار کے اثرات اقامت خانے کے طلبہ کے قلب و دماغ پر منعکس کرے۔ معمولی اور خانگی طرز کی گفتگو کے ذریعہ سے مشکل سے مشکل باتیں جس آسانی سے ذہن نشیں ہوسکتی ہیں۔ بڑی سے بڑی تقریروں اور تحریروں سے بھی نہیں ہوسکتیں۔ غرض اس طریقہ کار سے ہماری مطلوبہ یگانگت، ہم آہنگی، اور مخصوص تربیت کے حصول میں ایک کافی حد تک کامیابی ہوسکے گی۔

ایک اور ذریعہ سٹی کالج کے قدیم و جدید طلبہ میں یگانگت اور خاص تربیت کو نمایاں کرنے کا یہ ہے کہ ہر سال ایک سالنامہ شایع کیا جائے جس میں (۱) طلبۂ قدیم کے حالات، تصاویر، اور عملی دنیا میں کارگزاریاں بیان کی گئی ہوں (۲) ایسے مخصوص مضامین اور نظمیں درج ہوں جن کے مطالعہ سے طلبۂ قدیم و حال کی قلبی و دماغی کیفیتوں اور قابلیتوں کا مظاہرہ ہوسکے، اور آنے والے طالب علموں کو معلوم ہو کہ ان کے پیشرو اس درسگاہ سے کیسی تربیت حاصل کرکے نکلے اور اپنے جدا جدا عرصہ ہائے عمل میں کس طرح گامزن ہیں۔ (۳) ان مضامین کے ساتھ ایسے مقالے بھی شریک ہوں جن میں حیدرآباد کی معاشرتی، اقتصادی اور سماجی ضرورتیں اور اصلاحی تجاویز بھی قلمبند کی گئی ہوں (۴) اس درسگاہ اور اس کے موجودہ طلبا کی سال بھر کی خاص خاص مشغولیتیں اور دیگر واقعات قدیم طلبہ کی آگاہی اور دلچسپی کے لئے مندرج ہوں۔ اور (۵) اس سالنامہ کی ترتیب و اشاعت کے وقت اس امر کا ہر طرح خیال رکھا جائے کہ وہ سٹی کالج کے دیرینہ روایات کے شایان شان ہو اور اس کے ذریعہ سے طلبۂ قدیم و حال کے خیالات و حالات میں حتی الامکان ہم آہنگی پیدا ہوسکے۔



یادِ ایامِ طالب علمی

از

مولوی سیّد محمد صاحب ایم اے (عثمانیہ)

ہر شخص کی اسکولی زندگی اور زمانۂ طالب علمی کے ضرور چند واقعات اور حالات ایسے ہوتے ہیں جو اس دور کے گزر جانے اور اس ماحول کے نسیاً منسیاً ہو جانے پر بھی کبھی کبھی یاد آجاتے ہیں تو کچھ دیر کے لئے اس معصوم فضا کا سماں آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔ ہمارا زمانۂ طالب علمی جو سٹی ہائی اسکول میں گزرا وہ ایک ایسے عہد سے تعلق رکھتا ہے جب کہ قدیمی روایات اور پرانی باتیں بھولی بسری ہو چکی تھیں اور مدرسے کا مقصد وحید طلباء کی حد تک محض تحصیل علم اور اساتذہ کے نزدیک صرف تعلیم و تدریس سمجھا جا رہا تھا۔ مدرسے کا محل وقوع، حالات زمانہ کا اقتضا اور ارباب درس گاہ کا آمرانہ رعب داب ایسی چیزیں تھیں جو خواہ مخواہ ماحول مدرسہ میں خشکی اور انقباض پیدا کر رہی تھیں۔ جس طالب علم کو دیکھو دیوانہ وار لکھنے پڑھنے میں منہمک نظر آتا تھا اور صرف ایک مصدر پڑھنا ہی ایسا تھا جس کی گردان ہر بچے کی نوک زبان تھی۔

یہ ماحول سالانہ امتحان کی قربت کی وجہ سے اور بھی گہرا رنگ اختیار کئے ہوئے تھا کہ ہم اور ہمارے تین چار ساتھی ایک گھریلو مدرسہ یا بہ اصطلاح قدیم مکتب سے نکل کر سٹی ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ چند روز تک ہم نے بھی کچھ خوف زدگی اور کچھ حیرانی کے ساتھ اس ناخوشگوار ماحول میں وقت گزاری کی جب

سالانہ امتحان کا "روز جزا" بخیر و عافیت گزر گیا۔ اور گرمائی تعطیلات کے بعد ترقی پا کر دوسری جماعت میں پہنچے تو وہ اجنبیت جو ہم نوواردوں اور یہاں کے پرانے طلبہ میں تھی دور ہو گئی۔ اور اس جماعت کے فیل شدہ یا باران دیدہ طلبہ کے ساتھ ہم ترقی یابوں کا نیا رشتۂ ہم جماعتی قائم ہو گیا۔ پھر تو باوجود ان گوناگوں موانعات کے، جن کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، فضا میں کچھ خوشگوار تبدیلی کے آثار نمودار ہوئے اور زندگی و زندہ دلی کی لہر سی دوڑتی نظر آئی۔

مدرسے کے ساتھ کوئی ایسا میدان یا وسیع صحن تو ملحق نہیں تھا، جہاں طلبہ کی فوج باقاعدہ چھٹی کے گھنٹے میں یا صبح گھنٹی بجنے سے پہلے اور شام گھنٹی بجنے کے بعد، جمع ہو کر اپنی تیتر بٹیر پہ پڑ کر سکے، البتہ چھتہ، اور یوسف بازار کی پختہ مگر ناہموار چھتیں کسی قدر اس کی تلافی ضرور کر دیتی تھیں۔

حسن اتفاق کہئے کہ ہم جس جماعت میں ابتداً شریک ہوئے تھے اس کے ماسٹر صاحب کے برخلاف اس نئی جماعت کے، "ٹیچر ان چارج، (جو لڑکوں کی عام تعلیم و تربیت اور اخلاق و عادات کے ذمہ دار تھے) اخلاق ملکی کا نمونہ اور دیار مغرب، کے معلم تلخ گفتار و طلبہ آزار، کی ضد واقع ہوئے تھے۔ انکی سلیم الطبعی اور کم آزاری کا وہی نتیجہ ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ "استاد نحسیتں، کی ہیبت جو دل سے نکل گئی تو مطیع و منقاد طلبہ ہی میں چند سرکش اور ردیو صفت شخصیتیں پیدا ہو گئیں اور انہوں نے بے کم و کاست وہی صورت حال پیدا کر دی جس کو حضرت شیخ سعدیؒ نے کامل تیس سال کے طالب علمانہ تجربوں کے بعد اپنی کتاب گلستاں میں اس طرح بیان فرمایا ہے۔

استاد معلم چو بود کم آزار خرسک بازند کودکاں در بازار

سال بھر وہ کھلنڈرا پن ہوا اور ایسی دھما چوکڑی مچی رہی کہ ارباب مدرسہ کے تادیبی اعلانات اور نرم سزائیں مثلاً انفرادی تنبیہ یا جماعت کی ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں منتقلی وغیرہ سب بے سود ثابت ہوئیں اور اساتذہ کی متعدد گول میز کمیٹیوں کے باوجود اس سال کوئی خاص بندوبست نہ ہو سکا۔ انکی سال بھر کی رپورٹ کارگزاری اور روئداد حالات کی تفصیل تو بہت ہی طویل ہو گی جسکی

اس وقت گنجائش نہیں۔ اجمالی خاکہ یہ ہے کہ یہ حضرات صبح دس بجنے سے کچھ پہلے ہی، مدرسہ آجاتے اور گھنٹی بجنے کے بعد بھی، نیز دوپہر کو جب کہ غریب اساتذہ تین گھنٹے کی بکواس اور سرمغزی کے بعد کچھ دیر کے لئے آرام لیتے، یہ افضل دروازہ روڈ کے بھلے مانس اور غریب مزاج راہ روؤں کو یا چھتے کے امن پسند دوکانداروں کو طرح طرح سے دق کرتے۔ پھر ایسے عیارانہ طور پر کہ اگر کوئی فریادی جراءت کرکے اوپر چڑھ آئے اور ارباب مدرسہ کی امداد سے بھی ان کا پتہ لگانا چاہے تو یہ اس کے لئے قطعی ناممکن تھا اول تو غریب کو کمروں اور برآمدوں کی بھول بھلیاں میں پریشان ہونا پڑتا، دوسرے انکی کمین گاہیں کچھ ایسی محفوظ اور عام نظروں سے مخفی واقع ہوئی تھیں کہ خود اہل مدرسہ کو بھی مشکل ہی سے ان کا خیال آسکتا تھا تیسرے انکی عیاری اور چالاکی کے آگے سادہ لوح فریادیوں اور سیدھے سادے استادوں کی ایک نہ چلتی تھی۔ ان میں سے بعض تو شکار پر حملہ کرتے ہی کمند اور رسی کی مدد کے بغیر دومنزلے کے چھت پر پہنچ جاتے اور نہایت اطمینان سے پاؤں پھیلا کر لیٹ جاتے۔ بعض فوراً "میک آپ" بدل، اسٹیج سے ہٹ کر کتابیں بغل میں دبائے، دوسرے دروازے سے اس طرح بھلمنساہت کے ساتھ داخل ہوتے ہیں کہ گویا گھر سے ابھی آرہے ہیں۔

"میک آپ" کی تبدیلی میں دو صاحبوں سے بڑی مدد ملتی تھی اور انکی ٹوپیاں اور شیروانیاں ایسے موقع پر بہت ہی کار آمد ثابت ہوتی تھیں۔ ایک تو دیہاتی نووارد تھے جو بہت خاموش آدمی اور ایسے غریب مزاج تھے کہ نہ صرف طلبہ بلکہ بعض اساتذہ بھی انہیں مسکین میاں کے نام سے پکارتے تھے ان کی بھولی بھالی صورت، دیہاتی لباس اور تعلیم کا شوق ایسی خصوصیات تھیں کہ کوئی انکی طرف اس طرح کی شرارتوں کی بدگمانی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نہ صرف استاد بلکہ وہ لوگ بھی جو طلبہ کی شکایت لے کر اوپر آتے، ان کو دیکھ کر صاف کہہ دیتے تھے کہ نہیں صاحب انہوں نے تو ہمیں نہیں چھیڑا بلکہ بالکل ایسے ہی لباس کا کوئی اور لڑکا تھا۔ یہ سن بیچارے استاد کو بڑی حیرانی ہوتی۔ کیونکہ اس وضع کے لباس کا کوئی اور لڑکا اس جماعت میں کیا، مدرسہ بھر میں نہ تھا۔

دوسرے بزرگ ایک مرزا صاحب تھے۔ یہ تھے تو واقعی روکھے پھیکے اور بے مروت سے آدمی لیکن یاران طریقت نے باوجود ان کی بدمزاجی اور پھیکے پن کے ان کو بھی اپنے ساتھ گانٹھ لیا تھا اور جب چاہتے اِن کے کلاس کی مدد سے اپنا پارٹ کرکے پھر مرزا صاحب کو کتاب ہاتھ میں دے کر پڑھنے بٹھا دیا کرتے۔ وہ بھی اس متانت کے ساتھ بیٹھے ہوئے ورق گردانی کرتے کہ کوئی انکی طرف شبہ کی نظر نہیں ڈال سکتا تھا۔

ابتدا میں ایک مرتبہ مرزا صاحب نے اپنی طبعی بے مروتی کے جوش میں آکر ایک طالب علم کا راز فاش کرکے اُس کو سزا دلائی تھی، مگر برادری کے ایک فرد کے ساتھ ان کی ایسی حرکت اور اس طرح کی غداری پر انہیں بھی پنچایتی سزا بھگتنی پڑی۔ ساری جماعت غریب کی دشمن ہوگئی اور کافی مدت تک نہ صرف ان سے سوشیل بائیکاٹ رہا بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہی ستائے گئے۔ بارے اُنکی توبہ قبول ہوئی اور آیندہ کامل وفاداری کے قول و قرار اور معقول جرمانے کے بعد ذات جماعت میں دوبارہ داخل کئے گئے۔

اتفاق کی بات ہے کہ استاد جماعت کے علاوہ دوسرے اساتذہ بھی گوناگوں مفید صفات سے متصف ملے تھے۔ ریاضی کے استاد جامعۂ بمبئی کے تعلیم یافتہ اور ایک لائق مرہٹے تھے اگرچہ وہ ریاضی کے ام۔ اے تھے لیکن بی۔ اے میں انہوں نے فارسی بھی پڑھی تھی۔ ان کو فارسی سے طبعی لگاؤ تھا اور شاہنامے کے اشعار سنانے کے علاوہ فردوسی کا یونان کے ہومر اور ہندوستان کے کالی داس سے مقابلہ کرنا اور فارسی قدیم و سنسکرت کے لسانیاتی تعلق پر لکچر دینے کا شوق تھا۔ مگر بدقسمتی سے طلبہ کیلئے یہ چیزیں کسی طرح دلچسپی کا سامان نہیں مہیا کرسکتی تھیں۔

کبھی کبھی فرض شناسی کے جوش میں آکر ریاضی کے مسائل بھی تختۂ سیاہ پر حل کردیا کرتے تھے مگر اس طرح کہ جیلدار تختۂ سیاہ کو سفید کرنے اور طالب علموں کی طرف پیٹھ کرکے بورڈ سے مخاطب ہونے کے سوا اس کا کوئی اور فائدہ مرتب نہیں ہوتا تھا۔ ریاضی میں انکی لیاقت مسلم تھی۔ کئی دفعہ بعض طلبہ نے اونچی جماعت کی کتابوں سے مشکل سوالات نقل کرکے ان کے سامنے پیش کئے اور اس فارسی داں معلم ریاضی کی

لیاقت کو آزمانا چاہا۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ کسی سوال کے حل کرنے سے عاجز رہے ہوں۔ وہ ہمیشہ مسکراتے ہوئے اٹھتے اور چاک کا ٹکڑا لے کر چشم زدن میں نہایت ہی "مختصر عمل" سے بورڈ پر سوال حل کر دیتے۔ کبھی ہفتے عشرے میں پانچ پانچ چھ چھ سوالات کا ہوم ورک بھی دے دیتے تھے۔ مگر اس بارے میں کبھی کسی پر سختی نہیں کی۔ چالیس پچاس طلبہ میں سے چار چھ نے کچھ صحیح کچھ غلط حل کئے اور انہوں نے سرسری طور پر چند کاپیاں دیکھ لیں۔ پھر بورڈ کے پاس پہنچکر ایک ساتھ سب سوالات خود ہی حل کر دیئے اور کہہ دیا کہ انکو اتارلو۔

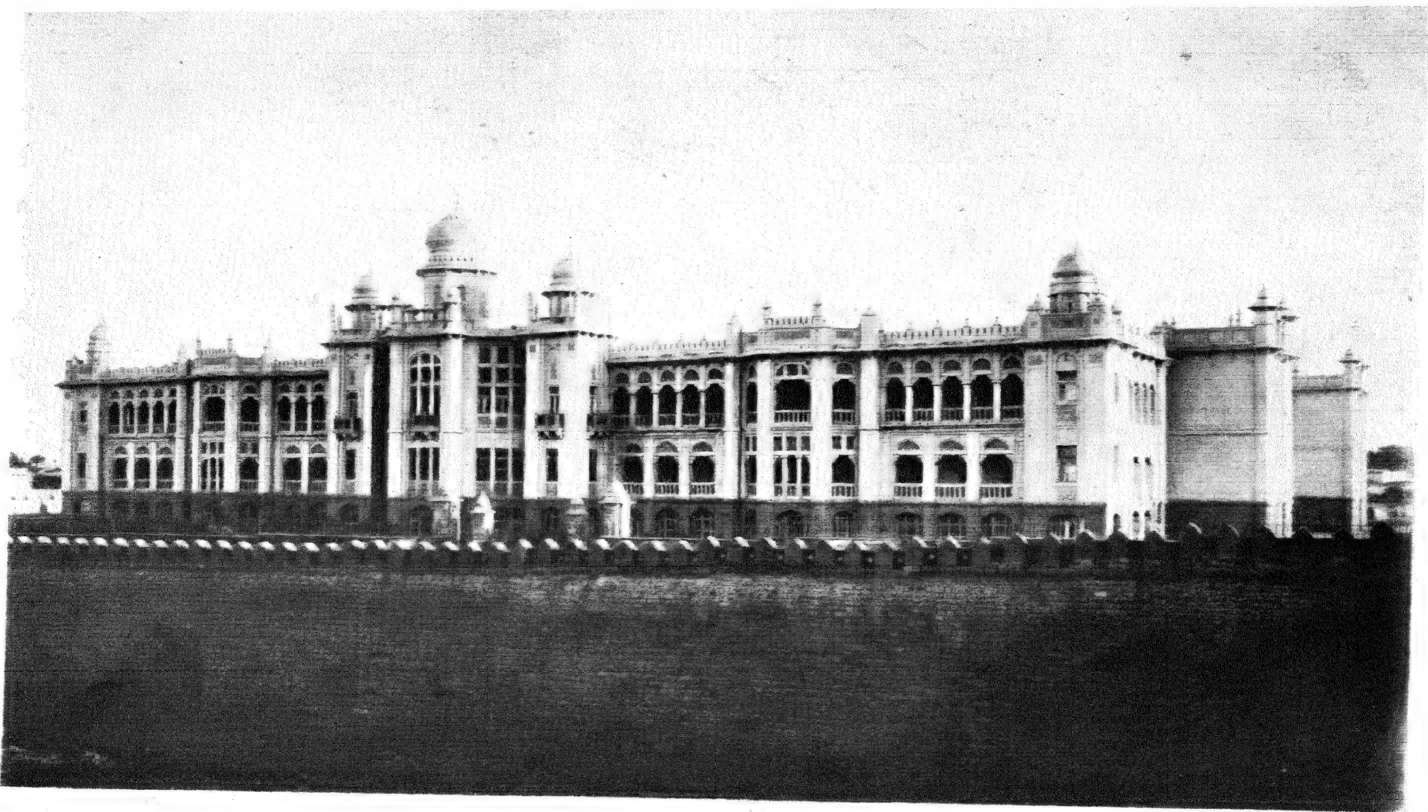
سونے پر سہاگہ یہ کہ انگریزی ادب و قواعد کی تعلیم کے لئے بھی ایک ایسے موزوں استاد ملے جو قدرتی شاعر اور پیدائشی فلسفی تھے۔ کتاب جنگ عظمیٰ کی "مختصر اور سلیس" تاریخ تھی۔ اگرچہ زبان و بیان جماعت کے معیار کے موافق کہی جاسکتی تھی۔ لیکن جنگ کے سیاسی و معاشی اسباب و علل، لڑائیوں کی تفصیلات، آلات حرب، جدید طریقہ ہائے جنگ اور بری و بحری فوج کی اصطلاحات وغیرہ ایسی چیزیں تھیں جنھوں نے اس دلچسپ کتاب کو کم عمر حیدرآبادی طلبہ کے لئے جن کی فوجی و جنگی معلومات صرف سکندرآباد کی سالانہ پریڈ کے سرسری معائنے تک محدود تھی، بالکل غیر دلچسپ اور ناقابل فہم بنادیا تھا۔ ماسٹر صاحب کو جماعت میں ذرا دیر ہی سے تشریف لاتے اور اکثر اپنے خیالات میں مفکرانہ طور پر مستغرق رہتے۔ لیکن کورس پورا کرنے میں دوسرے استادوں سے پیچھے کیسے آگے ہی تھے۔ باوجود متعدد معمولی اور غیر معمولی تعطیلات کے انہوں نے سال ختم ہونے سے پہلے ہی کتاب ختم کر دی اور اپنے نزدیک طلبہ کو امتحان کے قابل بھی بنادیا مگر طلبہ کا حال خود نہیں معلوم تھا یا امتحان کے دن ممتحن پر کھلا ہوگا۔

انہوں نے قواعد پڑھانے کا بھی نرالا ڈھنگ نکالا تھا۔ ابتدا اجزائے کلام میں سے ایک ایک جزو کو لیکر مسلسل دو دو دن اس کی اقسام، خصوصیات اور طریقہ ہائے استعمال وغیرہ نسفلیڈ کی بڑی گرامر کے پورے مواد کو اپنے فصیح و بلیغ لکچروں کے ذریعہ طلبہ کے گوش گزار کر دیا اور پھر ہر چیز کو اچھی طرح ذہن نشین کر دینے کے لئے سال بھر قواعد کے دن آٹھ آٹھ دس دس صیغے یاد کر لانے کا حکم دے کر یا تو فکر شعر فرماتے یا فکر عالم کون و فساد میں مراقبہ کرتے رہتے۔

اس قران السعدین سے ہماری تعلیمی دنیا پر جو اثرات مرتب ہونے چاہئے تھے وہ خاطر خواہ ہوئے اور سالانہ امتحان میں بحمد اللہ اسی فی صد طلبہ نے اسی جماعت کے در و دیوار کے ساتھ اپنی وفاداری کو استواری سے نباہنے کا عملی ثبوت دیا۔ جو لوگ ترقی پاکر دوسری جماعت میں گئے ان میں بھی دو تہائی تعداد "امتحاناً مکرر" کی شرط کے ساتھ دوسری جماعت میں ترقی کیسی، یوں کہئے کہ داخلے کے اہل بنائے گئے ہم تو اسکو اساتذہ کے خلق نرم دلی اور نیچے کی جماعت کے مسئلہ کثرت آبادی کو حل کرنے کی انتظامی ضرورت سمجھتے ہیں کہ اتنے طلبہ کی اس طرح منتقلی عمل میں آئی ورنہ از روئے انصاف و استحقاق صرف چار پانچ ہی اوپر کی جماعت میں ترقی پا سکتے تھے۔ ان ترقی پانے والوں میں مرزا صاحب اور مسکین میاں بھی تھے جنہوں نے تعجب ہے کہ باوجود جماعت کی تمام کارروائیوں میں اپنی در پردہ حصہ داری اور اوقات درس کی غیر درسی مشغولیت میں خفیہ شرکت کے اپنے آپ کو ناکامی سے بال بال بچا لیا۔

اگرچہ کہ آزادی کے اس دور کو ایک سال سے زیادہ قرار واقعی ثبات نصیب نہیں ہوا اور ارباب اقتدار کی تشدد آمیز پالیسی نے صورت حال بعد کو بدل دی لیکن یہ ایک سالہ تحریکات کچھ اس طرح جڑ پکڑ گئی تھیں کہ جب تک مدرسہ اس مقام سے اٹھ نہ گیا، کبھی کبھی اس کے اثرات ظاہر ہو ہی جاتے تھے اور "دستواری قانون شکنی" کے علاوہ بعض دفعہ چھوٹی چھوٹی پارٹیاں بھی بن جایا کرتیں اور اسی عمل کو دہرا کر زمانۂ گزشتہ کی یاد تازہ کر دیتی تھیں۔





سٹی ہائی اسکول (سٹی کالج) کی حالیہ عمارت

سٹی کالج کا محلِ وقوع

از

مولوی غلام محمد خاں صاحب بی اے (عثمانیہ)

سٹی کالج کی موجودہ عمارت کے محل وقوع کی نسبت عام لوگ صرف اس قدر جانتے ہیں کہ یہ موسیٰ ندی کے کنارے اور عدالت العالیہ کی عمارت سے ملحق مغربی جانب واقع ہے۔ ممکن ہے کہ کسی نے یہ سن لیا ہوگا کہ اس مقام پر جہاں آجکل سٹی کالج کی شاندار عمارت واقع ہے یہاں اس سے پہلے قدیم عمارتوں کے کھنڈرات تھے۔ بہت کم لوگ ہونگے جو اس حقیقت سے واقف ہوں کہ آج سے تقریباً دو ڈیڑھ سو برس پہلے اس قطعۂ زمین کو کس قدر اہمیت حاصل تھی۔ ہماری شائستگی اور ہمارے آثار ابھی بڑی حد تک پردۂ خفا میں ہیں۔

تاریخ دکن میں سلطان ابوالحسن تانا شاہ کا نام خاص طور پر مشہور ہے۔ اسکے شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے قصے آج تک خاص و عام میں مشہور ہیں۔ دکنی سلاطین میں نزاکت اور نفاست طبع کا وہ مجسمہ سمجھا جاتا ہے۔ اظہار نفاست کے متعدد طریقے تھے جنمیں ایک یہ بھی تھا کہ کسی اچھے مقام اور پر فضا منظر پر بہتر سے بہتر محل اور باغ وغیرہ تیار کرائے اور ان کو شاہی لوازمات سے زینت بخش کر اپنا تفریح گاہ بنائے۔ ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں اس قسم کے کئی ایک محلات اور باغات کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن فی الحال اس کے ایک مشہور مگر گم گشتہ "چار محل" کو اس مضمون کے سلسلے میں خاص اہمیت حاصل ہے جس کا ہم آئندہ ذکر کرینگے۔

نفاست کی طرح تاناشاہ کی فیاضی اور دریا دلی بھی زبان زد خاص و عام ہے۔ خود بادشاہ کا مقولہ تھا، "بادشاہان سلف خزینہ را بحفاظت داشتہ رفتہ اندوہ وما ہمراہ خویش خواہیم برد"[1] مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تاناشاہ بھی فراعنۂ مصر کی طرح آبا و اجداد یا خود کے جمع کردہ خزائن کو اپنے ساتھ مدفون کرانے کا خواہاں تھا۔ اپنے مطلب کی توضیح وہ آگے اس طرح کرتا ہے: "پس[2] دریک حصہ خزانہ عمارت چار محل بخرچ ہشت لک روپیہ بالائی جوبہار موسیٰ باحداث درآوردہ جشن ہا ترتیب داد کہ ہیچ چشمی بآن جا چشم ندیدہ و ہیچ گوشی بآں تزک نشنیدہ" جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ابوالحسن تاناشاہ ایک نہایت فیاض اور سخی دل بادشاہ تھا۔ اسکی وسیع نظر سینکڑوں یا ہزاروں کی تعداد سے کبھی سیر نہ ہوتی تھی جب تک کہ تعداد لاکھوں تک نہ پہنچ جائے۔ چار محل پر آٹھ لاکھ روپیہ کی لاگت بھی اسکی وسیع نظر میں کوئی چیز نہیں تھی مگر چونکہ ضرورت وقت کے اعتبار سے عمارت مذکور کو بہت زیادہ وسعت نہیں دی گئی اس لئے صرف آٹھ لاکھ روپیہ کا خرچ آیا ورنہ ممکن تھا کہ اسی عمارت پر اور کئی لاکھ روپیے خرچ ہو جاتے۔

افسوس کہ اس وقت ہم اس کا صحیح صحیح خاکہ نہیں کھینچ سکتے کہ چار محل کیا تھا اور کیسا تھا۔ کاش کہ اس دور کے مصور اور نقشہ نویس اس یکتائے روزگار اور نوادرہ دکن کی یاد کو کم از کم اپنے منحنی خطوط ہی کی شکل میں چھوڑ جاتے یا شاعر اپنے سحر آگیں الفاظ میں اس کا تھوڑا بہت خاکہ کھینچ دیتے مگر کسی نے اس طرف توجہ نہ کی۔ اس بارے میں دنیا صرف مورخین کی ممنون ہے۔ جنہوں نے اپنی سیدھی سادھی زبان میں چار محل کا تھوڑا بہت احوال سپرد قلم کر دیا ہے۔ گردھاری لال احقر نے لکھا ہے "پیش دولت خانہ سلطانی کنار دریائے موسیٰ بحکم تاناشاہ باغ رفیع و وسیع ...... و در آں باغ چہار محل زیبا و بہر گوشہ چہار محل چار چمن متساوی الاضلاع ...... و میان چہار محل حوض مربع ...... و در حاشیہ اطراف حوض صدہا فوارہا بدر ریزی برپا شدہ گنج گنج دریائے آبدار نثار کرد ......"[3] ہم ٹھیک طور پر یہ نہیں سکتے کہ

---

[1] گلزار آصفیہ صفحہ ۵ [2] تاریخ ظفرہ صفحہ ۵ [3]

یہ عمارت کس سنہ میں ختم ہوئی اور اسکی تیاری میں کتنے سال صرف ہوئے۔ ہاں مختلف روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۸۳ھ میں اس عمارت کی ابتدا ہوئی چنانچہ لکھا ہے "در سنہ یک ہزار ہشتاد و سہ ابوالحسن تاناشا...... تیاری چارمحل...... بحسن انصرام رسانید" مگر تعجب اس بات کا ہے کہ مولف تاریخ ظفرہ نے لکھا ہے "یکے از شاعران تاریخ بنائے ایں چارمحل چناں بقلم درآوردہ۔ تاریخ

خشت اول چو بر زمین بگذاشت ہاتفے گفت یا امام رضا

گویا اس مادۂ تاریخ کے مطابق ۱۰۹۴ھ میں چارمحل کی تعمیر کی ابتداء ہوئی درآں حالیکہ اوپر اس کا سنگ بنیا ۱۰۸۳ھ بتلایا گیا ہے۔ گویا اس طرح دونوں تاریخوں میں گیارہ سال کا فرق آتا ہے۔

قطب شاہی محلات میں چارمحل کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اسلئے کہ تاناشاہ نے اپنی تفریح اور دلچسپی کیلئے اسکو بنوایا تھا۔ اس وقت شاید اس محل کی شان و شوکت کا شاید ہی کوئی اور محل ہوگا اس کی اور گوشہ محل کی تعریف اور عظمت سے متعلق شہنشاہ ہند کے بیٹے شہزادہ کام بخش صوبہ دار دکن کے حالات کے ضمن میں یوں رقم طراز ہے کہ:۔

"آوردہ اند کہ اورنگ زیب بعد تسلط بر دولت قطب شاہیہ محمد کام بخش فرزند خود را بصوبہ داری حیدرآباد و ممالک متعلقہ آں مقرر کردہ خود متوجہ بلدہ فجستہ بنیاد گردید۔ شاہزادۂ مذکور عمارت عالیشان قلعہ محمدنگر و بلدۂ حیدرآباد نقلی چارمحل و گوشہ محل وغیرہ را گذاشتہ در محلہ اردو عمارت نو باحداث درآورد تا خود درآں میاں سکونت نماید۔ ہرگاہ ایں چیز بعالمگیر بادشاہ رسید فرمان بنام شاہزادہ محمد کام بخش صادر گشت کہ باوجود مکانہائے متعدد قطب شاہی از سر نو عمارت نو باحداث درآوردن بیجاست...... شاہزادہ عرض در جواب آں بدیں مضمون بقلم درآورد کہ آنچہ ارشاد کرامت بنیاد شرف صدور یافت عین مستحسن و در حقیقت حال ہم چنیں است اما فدوی را باوجود صوبہ داری و مختاری حیدرآباد و ممالک محروسہ و متعلقہ آں مقدوری نیست کہ روشنی چراغہائے معمولی شام درآں عمارات

عالیشان کہ بذات خود نمودہ باشد۔ تا بروشنی تمام شب و بودن درآنجا و بسر بردن او قات تا
چہ رسد۔ ایں حوصلہ ہماں شاہان بابرکات و سلاطین صاحب نیات بودہ کہ دریں عمارت
روشنی ہا کردہ تماشا ہا دیدہ و خود بہ تعمیر درآوردہ جشن ہائے شاہانہ نمودہ سکونت ورزیدہ
اند فدوی بقدر حوصلہ و مقدور خویش مکانی کوچک بہ تعمیر درمی آرد تا درآں میاں بماند"

شاہان دہلی کی عظمت و بزرگی ان کی بلند حوصلگی، اور وسیع النظری کا کون شخص قائل نہیں۔ انکے فن تعمیر کا ذوق زبان زد عام ہے۔ لال قلعہ کے محلات ہندستان میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ تاج محل جیسی نادر روزگار عمارت شاہان مغلیہ ہی کی یادگار ہے۔ ایسے اولوالعزم شاہی خاندان کا ایک فرد جب شاہان دکن کی عمارتوں پر نظر ڈالتا ہے تو وہ اس کو اپنی حیثیت بود و باش سے کہیں وسیع اور عالیشان دکھائی دیتی ہیں۔ وہ صاف الفاظ میں ان عمارتوں کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ان محلات میں روزانہ معمولی روشنی تک کرنا اسکی ہمت سے باہر ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے ہم چارمحل کی وسعت کا بھی کچھ نہ کچھ اندازہ کرلے سکتے ہیں اگر چارمحل کی عمارتوں کو موسی ندی کے کنارے سے وسعت دیجائے تو موجودہ محلوں کے اعتبار سے محبوب کی مہندی، بسری الادہ، رکاب گنج اور اطراف و جوانب کے کئی محلے اس دائرے میں داخل ہوجاتے ہیں۔ اور حقیقت میں ایک عمارت کے لئے یہ رقبہ اس قدر وسیع تھا کہ اسکی نظیر ابتک نہیں دیکھی گئی۔

چارمحل کی عمارت اور باغ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا تانا شاہ نے محض تفریح کی خاطر بنوایا تھا۔ جہاں دل بہلائی کے مختلف سامان موجود تھے۔ عمارت کے اندرونی حصہ میں مختلف قسم کی دلچسپیاں موجود تھیں۔

چارمحل کی پوری عمارت جیسا کہ خود نام سے ظاہر ہے چار حصوں میں منقسم تھی جس کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا اور خوش وضع حوض تھا۔ اس کے اطراف چمن بندی تھی جس میں جا بجا فوارے اپنی سحرکاری کے نمونے دکھاتے تھے۔ بادشاہ کا معمول تھا کہ روزانہ شام محل سے باہر حوض کے اطراف مربع چبوتروں میں سے شہ نشین حصہ پر آکر بیٹھ جاتا اور پری پیکر حسن کی دیویاں اپنی معشوقانہ اداؤں اور دلربا اندازوں کے ساتھ آکر رقص و سرود اور ساقی گری کی محفلیں گرما دیتیں۔ جب تک جی چاہتا یہی رنگ جما رہتا۔ مکان کے اندرونی حصہ میں تو

اور ہر قسم کے جشن ہوتے تھے اور اکثر حوض کی بھی سیر ہوتی تھی جس کا ذکر ایک مورخ نے ان الفاظ میں کیا ہے

"سلطان ذیشان دریں مکان مینو نشان اکثر اوقات سراپا حسنات جشن ہائے عالی ترتیب داده با پری چہرہ گان سیم اندام ورنواڑہ نشستہ بہ سیر تماشائے عالم آب خاطر را مسرور می ساخت"

چونکہ چار محل کی عمارت رود موسیٰ کے کنارے تھی اسلئے شاید اسکو ندی محل کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا اگرچہ عمارت مذکور اس نام سے مشہور نہیں ہوئی تاہم یہ نام تاریخی اہمیت ضرور رکھتا ہے چنانچہ گردھاری لال احقر نے لکھا ہے۔

معماران چابک دست برائے تفرج دریائے موسیٰ و مجلس دیوانی کنار رود مذکور در فضائے وسیع قصری کہ نمونہ بستان ارم چوں ساحت فردوس خرم بود تیار ساختہ شرفات بلندش را از ذروۂ مہر گذرانیده و بر عقب آں عمارت میدانی کہ طول و عرض از حد بود ترتیب داده نام آں "ندی محل" نہادند"

بہرحال ندی محل یا چار محل کی عمارت بادشاہ وقت کی تفریح طبع کیلئے خاص اہتمام کے ساتھ تیار کرائی گئی تھی۔ اس عمارت کے تیار ہونے کے بعد بادشاہ کو خیال پیدا ہوا کہ اس کا جواب بھی تیار ہو چنانچہ اسی خیال کے تحت چار محل کے مقابل کچھ فاصلہ پر اسی نمونہ کا ایک محل تیار کرایا گیا جس کے بیچ میں ایک بہت بڑا حوض بھی بنوایا گیا جسکا رقبہ چار محل کے حوض سے بڑا تھا۔ اس مقام کا نام جہاں یہ حوض اور عمارت تیار ہوئی قصبۂ گوشہ تھا۔ اسی کی مناسبت سے اس محل کا نام گوشہ محل رکھا گیا۔ اگرچہ اب وہ پوری عمارت باقی نہیں رہی تاہم اسکی کچھ یادگار گوشہ محل کی بارہ دری کے نام سے باقی ہے جس میں آج کل فری میسن لاج کا دفتر ہے۔ یہ باقی عمارت بھی اپنی اصلی شکل و صورت میں نہیں ہے کیونکہ بوسیدہ و ناکارہ ہونیکے باعث حال حال میں بہت کچھ تعمیر اور ترمیم کیگئی ہے تاہم گوشہ محل کی یاد تازہ کرنے کے لئے اس عمارت کا ایک حصہ بھی کافی ہے۔ گوشہ محل کی عمارت کے ساتھ کا وسیع حوض تباہ شدہ حالت میں ابتک باقی ہے جو گوشہ محل کے حوض کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ابو الحسن نے قلعۂ گولکنڈہ میں بھی

اس وسعت کا ایک اور حوض بنوایا تھا جس کا نام کٹورہ حوض ہے۔ ان حوضوں میں پانی بھرا رہے تو حوض نہیں بلکہ تالاب اور کنٹے نظر آئیں کم از کم دکن کی تاریخ میں اس قسم کی عظیم الشان چیزوں کا سوائے ابوالحسن تاناشاہ کے اور کسی کے عہد ماضی میں پتہ نہیں چلتا۔

دنیا کی ہر چیز کو زمانہ کی ستم ظریفیوں کا شکار ہونا پڑا ہے۔ دنیا کے بہترین دماغ اور اولوالعزم ہستیاں ایک نہ ایک دن عدم کا راستہ دیکھتی ہیں۔ اسیطرح اس ہستی ناپائیدار کی کسی اور شئے کو بھی دوامی قیام ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتا۔ لاکھوں بلکہ کروڑہا روپئے کی پائدار سے پائدار عمارتوں کو بھی زوال نصیب ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑے اسکیم اور لاجواب کارنامے بے نام و نشان ہوجاتے ہیں۔ وہی چار محل جسکی عظمت و بزرگی اور شان و شوکت کا ہم نے ذکر کیا اور وہی عیش گاہ جنت نما جس میں حور نما مہ جبینوں کا ہمیشہ میلا رچا رہتا تھا اور وہی دلفریب منظر والی عمارت جس میں ابوالحسن تاناشاہ جیسے نازک دماغ بادشاہ کی دل بہلائی کا سامان مہیا رہتا تھا۔ حادثات زمانہ کے اثر اور دست ظلم سے نہ بچ سکی۔ یکے بعد دیگرے مختلف حادثات نے آخر اسکو ختم ہی کرکے چھوڑا

ابوالحسن تاناشاہ کی نظربندی کے بعد یہ نگری بھی اجڑ گئی اور اسکی وہ پہلی سی شان و شوکت باقی نہیں رہی، شاہی عمارتوں کا کوئی قدرداں نہیں رہا۔ اس لئے کہ ان کی نگہداشت بھی جیسا کہ اوپر مذکور ہوا حکمرانوں کی قوت سے بھی باہر تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد یہ نتیجہ ہوا کہ عمارت مذکور کس مپرسی کی حالت میں پڑ گئی اور نواب نظام علیخاں کے عہد تک تو اسکی یہ گت بن گئی تھی کہ ایک شاہی عمارت پر فوجیوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔ "نظام علیخاں" میں سراج الدین طالب نے لکھا ہے "احکام برطرفی کے بعد فرانسیسی فوج نے مقابلہ کا تہیہ کرلیا ...... اور اسی سمت میں کچھ منازل طے کرکے اپنا رخ حیدرآباد کی طرف پھیرا اور وہاں پہنچکر بلدۂ حیدرآباد کے مرکز میں "چار محل" کو اپنی جولانگاہ قرار دیا" گردھاری لال احقر کی تاریخ سے اس واقعہ کی مزید تائید ہوتی ہے لکھتے ہیں "حیدر جنگ ازیں معنی متردد شدہ ابراہیم علی خاں راکہ در شہر بود از دغا گشتہ و لشکر فرنگ را از بیرون برداشتہ در چار محل کہ از سابق فرودگاہ آنہا بود داخل شدہ بر دروازہ شہر حویلی فرنگیاں و گاڑیاں نشانیدہ و ذخیرہ ...... بنمودہ آمادۂ جنگ شد ...... سرداران مرہٹہ بروز داخل شدن او بچار محل اسپاں

تافتہ جنگ انداختند"۔ یہ لڑائی جیسا کہ خود عبارت متذکرہ سے واضح ہے مرہٹوں اور فرانسیسیوں کے درمیان ہوئی تھی۔ مرہٹوں نے گوشہ محل پر اور فرانسیسیوں نے اپنی فرودگاہ چارمحل پر مورچہ بندی کی تھی۔ اس جنگ میں ہر دو محلات کو شدید نقصانات پہنچے تھے۔ تاہم اس کے بعد بھی ان عمارتوں میں شاہانہ شان و شوکت ضرور باقی تھی۔ مگر فوجی مرکز بننے کے باعث آئے دن عمارت کے مختلف حصے خراب ہوتے جارہے تھے۔ فرنگی فوج نے چارمحل کی عمارت کے مختلف حصے مختلف کاموں میں لگا رکھے تھے۔ چنانچہ ایک وسیع طاق کو بارود خانہ بنا رکھا تھا۔

چارمحل کی عمارت خاص اہتمام سے بنائے جانے کے باعث بہت ہی پائدار واقع ہوئی تھی۔ جس پر موسی ندی کی معمولی طغیانیوں کا مطلق اثر نہیں ہوتا تھا۔ اس کے متعلق تاریخ ظفرہ میں لکھا ہے کہ "بتاریخ شانزدہم ماہ جمادی الثانی ۱۱۸۵ھ ۔۔۔۔۔ روز پنجشنبہ از وقت سہ پہر تا نصف شب دریا دریا چناں باراں شد کہ روئے زمین لبریز آب گردید ۔۔۔۔۔ وقت نصف شب دریائے موسی از بس طغیانی چوں بحر مواج جوش زدہ از دروازہ پل تا چادر گھاٹ بست چار دیوار شہر پناہ شکستہ درون شہر آمدہ آبادی دروازہ پل و مابین آں و آبادی چارمحل ورکاب گنج ۔۔۔۔۔ درسیلاب رفت ۔۔۔۔ بعضے مکانہا کہ پایہ آں استوار بود مثل چارمحل و عاشور خانہ بادشاہی ۔۔۔۔۔ درعین صدمات سیلاب قائم ماند" اس میں شک نہیں اس واقعہ سے چارمحل کی مضبوطی کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ طغیانی میں بھی اس کا بال تک بیکا نہ ہوا مگر تابکے طغیانی طغیانی ہی ٹھہری۔ چنانچہ بعد کی طغیانی میں "پایہ استوار" وغیرہ کو بے استواری ہی دیکھنی پڑی لیکن اس سے پہلے چارمحل کی عمارت باروت کے حادثہ سے تباہ ہوچکی تھی جسکو مورخ نے یوں بیان کیا ہے "از وقت صلابت جنگ بہادر چارمحل بادشاہی فرودگاہ فرنگیاں ۔۔۔۔۔ وغیرہ شد دریک محل کہ جانب جنوب بود کوٹھہ باروت مقرر شد۔ سبب طوفان بارش بان و باروت نمناک شدہ بود لہذا بتاریخ بست و ہفتم ماہ مذکور سنہ الیہ گرما دادہ باز در کوٹھہ نہادہ مسدود کردند و اللہ اعلم چہ قسم آتش افتاد کہ یکبارگی تمام محل پریدہ پاش پاش شد۔ شہتیر چوبہا و سنگ ہا بفاصلہ دور دور افتادند۔ ہفتاد ہشتاد کس مردم کہ اندرون محل و اطراف آں بودند بعضے سوختہ

مروند و بعضے زخمی شدند۔"

صاحب گلزار آصفیہ نے لکھا ہے۔ "بتاریخ بست و سوم ماہ محرم ۱۱۷۱ھ آنچناں طوفان باراں شد کہ۔۔۔۔ دیوار شہر پناہ و چار محل تنظیم آں از جا برخاستہ سر فرو کرد" مگر یہ صحیح نہیں ہے اسلئے کہ صاحب بستان آصفیہ اور تاریخ رشید الدین خانی کے مولف کو اس سے اتفاق نہیں چنانچہ صاحب بستان آصفیہ نے بھی چار محل کے انہدام کی اصل وجہ وہی لکھی ہے جس کو ہم نے اس سے پہلے ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے "مگر ۲۷ ربیع الثانی ۱۱۸۵ھ کو اس محل کے بارود خانہ میں آگ لگ گئی اور ساری عمارت جل کر خاک ہو گئی۔" اور مولف تاریخ رشید الدین خانی نے لکھا ہے کہ "اکیسویں جمادی الاول ۱۱۸۷ھ۔۔۔۔۔ بسبب امساک باراں کے واسطے۔۔۔۔۔ طلب نزول باراں کے۔۔۔۔ کہتے ہیں ۔۔۔۔ جمعہ کے دن رود موسیٰ کو ایسی طغیانی ہوئی کہ۔۔۔۔۔۔ ستائیسویں تاریخ ماہ مذکور کی چار محل کے باروت خانہ میں آگ گر کے اس محل بادشاہی کو نیست و نابود کر دیا اور بہت سے آدمی جل گئے۔"

چار محل کے انہدام کی ایک شخص نے تاریخ لکھی ہے جس کو منشی قادر خاں نے یوں ظاہر کیا ہے۔ "ابو الحسن تانا شاہ یکے چہار محل بر کنار رود موسیٰ مشتمل بر چار عمارت و در وسط آں حوض در نہایت وسعت بود۔۔۔۔ و چار محل را باروت خانہ ساختہ بودند قدرے باستقبال باروت رفت و قدرے بسبب طغیانی آب موسیٰ شکست دریں مادہ شخصی مطلع گفتہ۔ بیت

اشک آہم صبر و طاقت از دل بے تاب مرد
پارہ او سوخت آتش پارہ او آب برد"

بہر حال مختلف تاریخوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۷۷۱ء میں موسیٰ ندی میں طغیانی ہوئی چار محل میں فرنگی فوج کی جو باروت محفوظ تھی بھیگ گئی اسکو باہر نکال کر دھوپ دیگئی پھر اسی کوٹھے میں بند کر دیا گیا مگر نہ معلوم کوٹھے میں آگ کی چنگاری کس طرح پڑ گئی جسکے باعث باروت کے کوٹھے کو دھماکہ ہوا اور پوری عمارت چار محل کی منہدم ہو گئی اور یہ مٹی کے تودے ۱۳۲۶ھ کی بڑی طغیانی تک اسی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ جن بزرگوں نے چار محل کی عمارت کے مٹی کے ڈھیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ مٹی کا ایک بہت ہی

بڑا ٹیلہ معلوم ہوتا تھا۔ مگر بڑی طغیانی کے پہلے ہی حملے نے اسکو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر ایسا بہا دیا کہ چار محل کا نام ونشان تک باقی نہ رہا سوائے چار محل کے دروازے اور کھڑکی کے دروازہ چونکہ بہت بوسیدہ ہو چکا تھا۔ جس کے گرنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے چند سال بیشتر اس کو منہدم کردیا گیا۔ فصیل میں کھڑکی کی یادگار اب تک باقی ہے جو چار محل کی کھڑکی کہلاتی ہے۔ یہی کھڑکی سٹی کالج سے متصل کوتوالی ٹھانہ کے بالکل پیچھے واقع ہے۔ اس ٹھانہ کو بھی چار محل کا ٹھانہ کہا جاتا ہے۔ سٹی کالج جس رقبہ پر واقع ہے اور اس کے ملحقہ حصہ کا نام چار محل کا محلہ ہے۔ مگر چونکہ اس وقت وہاں مکانات وغیرہ نہیں ہیں اسلئے یہ نام رائج نہیں ہے۔ طغیانی کے کئی سال بعد یعنی ۱۳۲۰ف میں سٹی کالج کی شاندار عمارت اس قابل فخر خطہ زمین پر واقع ہوئی جو ایک اولوالعزم بادشاہ کی عشرت گاہ بنا ہوا تھا۔ اس خطہ کو اب بھی وہی اہمیت حاصل ہے جو آج سے دو تین سو سال پہلے حاصل تھی بلکہ اس سے کہیں زیادہ اس لئے کہ اب وہ حصۂ زمین گہوارۂ علم وادب بنکر ہر سال بہتر سے بہتر دماغ پیدا کر رہا ہے سٹی کالج کے سپوت اپنے آپ پر جس قدر بھی فخر وناز کریں بجا ہے اس لئے کہ انکی تعلیم وتربیت ایک ایسے مقام پر ہوتی ہے جس سرزمین کی رگ وپے میں عہد ماضی کے اعلیٰ اثرات سرایت کئے ہوئے ہیں۔



ایک شہر کا منظر شب

از نواب محمد بہاء الدین خاں صاحب وقار

دو بجے ہیں رات سے مخلوق ہے سب بہرہ مند
ٹمٹاتی شمع کے شعلے بھی ہیں پست و بلند

پاسباں کو نیند کے مارے نہیں اپنی خبر
کیا کرے اب خاک وہ نگرانیٔ دیوار و در

محنتِ جانکا جو کر کے دن بھر تھک گئے
اب پڑے بستر پہ ہیں وہ نیند کے ماتے ہوئے

تجھ سے ہے خواب گراں انکو بڑی دولت نصیب
جنکی قسمت میں خوشی ہے جنکو ہے راحت نصیب

کون ہے پر جو ترے زیر اثر آتا نہیں
جاگتا اس وقت تو کوئی نظر آتا نہیں

ہاں فقط وہ جو خدا کی یاد میں بیدار ہے
اور وہ جو مجرم و خاطی ہے بد کردار ہے

ایک وہ عیاش جو غارت گرِ ناموس ہے
دوسرا بدبخت جو آرام سے مایوس ہے

ہیں یہی دو چار اس نعمت سے جو محروم ہیں
ورنہ یہ نیند اور انساں لازم و ملزوم ہے

گر بلاکش کو ہے دھن۔ جام تہی ہو پُر زر سے
تو لٹیرا نیم شب کی گشت میں مصروف ہے

عاشقِ بیدل جو ہے محرومِ وصلِ یار سے
ہاتھ اب اٹھتے ہیں اسکے خودکشی کیواسطے

رات کیوں ضایع کروں پڑھ پڑھ کے کہنہ داستاں — کیوں نہ دیکھوں عہد نو کی طبع کی جولانیاں
گشت اکیلا ہی مجھے اس وقت کرنا چاہیئے — شہر کی سنسان حالت کا نظارہ چاہیئے
خود فروشی نے جہاں رکھی تھی اک ہل چل مچا — کچھ ہی گھنٹے قبل مجھکو اک تماشا سا وہ تھا
لیکن اب وہ حسن کی شوخی و طراری نہیں — کوشش انسان کی اب وہ گرم بازاری نہیں
جس طرح اک طفلک نا فہم ہو ہٹ پر اڑا — اور اپنی ضد سے جو رو رو کے تھک کر سو گیا
پس یہی معلوم ہوتا ہے کہ سارے ولولے — آپ اپنے شور سے تھک کر دلوں میں دب گئے

آہ ہے کیسی اداسی ہر طرف چھائی ہوئی — کیا سکوت افزا ہے اُن بجھتے دیوں کی روشنی
پر سگ در ہے حفاظت کو جو اک بیٹھا ہوا — ہمنوائے ساعت بیدار ہے اس کی صدا
ہے خموشی کا تسلط کھلبلی مسدود ہے — کبر انسانی کا سب شور و شغب مفقود ہے
ہاں مگر ایسی گھڑی ہی ہے نہایت کارساز — آئینہ انساں کی ہے خود بینوں کا اس سے راز

وقت ایسا بھی کوئی اے چرخ آئے گا ضرور — بے قیود روز شب تنہائی کا ہوگا ظہور
خاک ہو کر شہر مثل شہرباں رہ جائے گا — ایک ویرانہ سا ویرانہ یہاں رہ جائیگا

کیسے کیسے شاہ تھے ملتا نہیں جن کا نشان — بے حساب ان کے فتوحات انکی خوشیاں بیکراں
وہ سمجھتے تھے کہ ہے انکو بقائے لایموت — ہے یہی کوتاہ نگاہی اور ڈھٹائی کا ثبوت
اپنے ہے اخلاف کو ان کا پتہ چلتا نہیں — کوششیں اس کے لئے کرتے ہیں وہ کیا کیا نہیں
ان کے کاشانوں پہ ہے اب جس مسافر کا گذر — اک تباہی سی تباہی اس کو آتی ہے نظر
حال یاں کھلتا ہے اسپر ہستی بے بود کا — اب سمجھتا ہی کہ ہے دنیا کی ہر شئی کو فنا

قلعہ تھا جس جا وہاں سبزہ ہی مرجھایا ہوا — خاک میں سب کر و فر اور جاہ و منصب مل گیا
تھی جو خلوت گاہ شاہی تھا جہاں دیوان عام — ہے وہاں ہر قسم کے مار ان سمّی کا قیام
کیسے کیسے تھے معابد ہو گئے جو زیر خاک — انکی پامالی کا منظر ہے نہایت دردناک

ساری بربادی کے یہ اسباب پے در پے ہوئے ہو چکے تھے ناتواں عیش و ہوس کے ہاتھ سے
خیر اندیشان دولت کو کیا دریوزہ گر بخششیں ہوتی تھیں اُن پر جو تھے منظورِ نظر
انکی دولت غیر کے آنکھوں میں کانٹا ہو گئی کر لیا یک لخت اس نے قصد حملہ آوری
گو کہ پہلے مرتبہ ہی پائی اک خاصی شکست پر نہ تھا کم ظرف ہوتا حوصلہ اس کا جو پست
حملہ آور عزم و استقلال سے ایسا ہوا کامیابی پا کے سارے شہر کو غارت کیا

کس قدر خاموش ہیں سنسان ہیں وہ راستے تھے گھڑی بھر قبل جن پر رہروؤں کے جمگھٹے
اب تو بالکل چیدہ چیدہ لوگ آتے ہیں نظر وہ بھی اپنے برقع ناموس کے ہیں پردہ دور
جس سے دن بھر ہو نہ سکتا تھا کسی پر آشکار انکی نفس آلودگی کا راز ان کا حال زار

ہاں مگر وہ کون ہیں رستے ہیں جن کی خوابگاہ اہل دولت ہی کے در پہ ہے جنہیں غم سے پناہ
آہ یہ آفات کے مارے ہیں پردیسی غریب یا کوئی آوارہ رسوا یا یتیم و بد نصیب
ان کی حالت اس قدر ابتر ہے ایسی ہے تباہ عدل کی امید بھی ان کے لئے ہے اک گناہ
اور ان کی کلفتیں اتنی بڑی ایسی شدید غیر کا افسوس بھی ہے ان کے حق میں ناپدید
انکی حالت پہ فقط افسوس ہی ہوتا نہیں بلکہ اک ہیبت سی ہو جاتی ہے دل میں جاگزیں
بعض ایسے ہیں کہ جن کے تن پہ ہے کپڑا گراں بعض ہیں امراض کے باعث نحیف و ناتواں
ہائے دنیا کو انہیں اپنا سمجھنا عار ہے ہر کسی کو ان کی اب امداد سے انکار ہے

کیا سبب کیوں ہیں جہاں میں آدمی پیدا ہوا کیا انہیں ان آفتوں میں دیکھنے کو مبتلا
یہ ہیں وہ آفات جن پر بس نہیں چلتا مرا میری ہر کوشش ہے ان کے واسطے بے فائدہ
اے غریبو ۔ بے دیارو ۔ یہ جہانِ بد سرشت طعن اور تشنیع سے کرتا رہے گا تم کو زشت
کب تمہارے قلب کی تسکین اسے منظور ہے یہ تو بربادی میں کوشاں ہے تمہارے پے بہ پے
محض وہمی اور بے مقدار بے آرامیاں سب یہ ہیں اہل دول کی طبع نازک پر گراں

مر رہا ہے گر کوئی مفلس تو کچھ پرواہ نہیں — کیا ستم تجھ پر ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں
خود وہی قانون جو سب کے لئے ہے اک بچاؤ — بیکس و مظلوم کے حق میں نہیں کرتا نباؤ

کیوں مرا دل اس قدر پُر درد و ذی احساس ہے — مفلسوں کی خستہ حالی کا اسے کیوں پاس ہے
آہ میں کیوں اس قدر بے مایہ بے مقدور ہوں — دردمندوں کی مصیبت دیکھکر مجبور رہوں
رحم اس حالت میں جب امداد کی قدرت نہیں — رحم کرنیوالے کو کر دیتا ہے اندوہگیں
اُن سے بڑھکر اسکی حالت ہونے لگتی ہے تباہ — غیر کا محتاج رکھتا ہے جنہیں بخت سیاہ

(ماخوذ از سٹی ٹائٹ پیس)



سٹی کالج کے بعض قدیم طلبہ

از

مدیر

سٹی کالج حیدرآباد کی ایک قدیم ترین درسگاہ ہے۔ گذشتہ ساٹھ پینسٹھ سال کے عرصہ میں ہزاروں طلبہ اس سے فیض یاب ہوئے جو آج ممالک محروسہ سرکار عالی کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور اپنی اپنی بساط کے مطابق ملک و مالک کی خدمت میں سرگرم ہیں ان میں سینکڑوں ایسے ہیں جنہوں نے اپنی خاص قابلیتوں اور اعلیٰ کردار کی وجہ سے ملک کی موجودہ ترقی و اصلاح میں خاطر خواہ حصہ لیا ہے۔ ان سبھوں کا تذکرہ وقت واحد میں ممکن نہیں اگر کوئی باہمت اس کی طرف متوجہ ہو تو سٹی کالج کے خاص خاص سپوتوں ہی کے ذکر میں ایک مبسوط کتاب تیار ہو جائے۔

اس سال انجمن طلبہ قدیم کی مجلس انتظامی نے جب سالنامہ شایع کرنے کا اعلان کیا اور طلبۂ قدیم سے قلمی امداد کی درخواست کی تو بہتیرے اصحاب سے ان کے حالات بھی طلب کئے مگر تعجب ہے کہ خاطر خواہ جواب وصول نہیں ہوئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ صرف ۲۴ برادران قدیم ہی نے اپنے حالات بھیجے چنانچہ انہی کو اس پہلے موقع پر پیش کر دیا جا رہا ہے۔ اور شاید اس سالنامہ کی بساط کے لحاظ سے یہ کوئی بڑی تعداد بھی نہیں اگر ہر سال سالنامہ نکلتا رہے اور اس میں کم از کم بیس ہی طلبۂ قدیم کا تذکرہ شامل رہے تو پانچ سال میں

سو (۱۰۰) برادرانِ قدیم نئی پود سے روشناس ہو جائینگے۔ اُس وقت ان ننانوے شخصیتوں کا تذکرہ ہی یکجا کر دیا جائے گا تو یقیناً ایک اچھی سی کتاب بن جائے گی۔ جس کا مطالعہ نہ صرف سٹی کالج کے نت نئے فرزندوں بلکہ ہر مدرسہ کے طالب علموں کے لئے بصیرت افروز ثابت ہوگا۔ وہ معلوم کریں گے کہ ہمارے پیشرو مدرسہ کی چار دیواری میں سے کیسی تربیت حاصل کر کے نکلے اُن کے قلب و دماغ کی گہرائیوں میں مدرسہ اور اساتذہ کے بارانِ فیض سے صدق و صفا اور علم و فضل کی کیسی کیسی سرچشمے سوتیں جاری ہوئیں۔ جنہوں نے دوسروں کو بھی سیراب کیا

۲

اُن چوبیس اصحاب کے علاوہ جن کا یہاں تذکرہ پیش کیا جائے گا متعدد ایسے ہیں جن کا ذکر پہلے موقع پر پیش ہونا چاہئے تھا، مگر افسوس ہے کہ اس وقت تک ان کے کماحقہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔

سٹی کالج نے جہاں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صدر عربی و فارسی جامعۂ الہ باد، ڈاکٹر محمد نظام الدین صدر فارسی جامعہ عثمانیہ، ڈاکٹر میر ولی الدین پروفیسر فلسفہ، قاری قطب الدین صاحب پروفیسر اخلاقیات، مولوی صلاح الدین صاحب پروفیسر نفسیات، مولوی عبدالقادر سروری صاحب پروفیسر اُردو، مولوی سید محمد صاحب مددگار سٹی کالج، اور مولوی ابوالمکارم فیض محمد صدیقی صاحب مددگار مدرسہ نامپلی وغیرہ کی شکل میں علم و فضل کے سرچشمے جاری کئے، مولوی سید محمد اعظم صاحب صدر سٹی کالج، مولوی سید خورشید علی صاحب ناظم دفتر دیوانی و مال و ملکی وغیرہ، مولوی قاضی زین العابدین صاحب اول تعلقدار آصف آباد، مولوی خواجہ معین الدین انصاری صاحب مددگار فینانس، مولوی مرزا محمد علی بیگ صاحب نائب ناظم جنگلات، مولوی میر محمود علی صاحب نائب کوتوال بلدہ مولوی غلام قادر صاحب نائب صدر سٹی کالج، مولوی سید احمد محی الدین صاحب مدیر رہبر دکن، مولوی نا اسمٰعیل مرزا صاحب مہتمم کروڑگیری وغیرہ کی شخصیتوں کے ذریعہ سے حکومت کے مختلف شعبوں کی تنظیم و اصلاح میں حصہ لینے اور عام ملکی خدمت کرنے والوں کا اضافہ کیا۔ اسی درسگاہ کے فیض یافتوں میں مولوی سید عارف الدین صاحب ناظم تعمیرات، مولوی انوار اللہ صاحب صدر مہتمم تعمیرات، مولوی عبدالقیوم خاں صاحب، انجنیر عمارات جامعہ عثمانیہ، اور مولوی لائق علی صاحب مددگار معتمد تعمیرات جیسے انجنیر شامل ہیں جو ملک کے ماہرین تعمیرات

میں خاص حیثیت کے مالک ہیں۔ اسی طرح ماہرینِ قانون میں مولوی ہاشم علی خاں صاحب ناظم اول فوجداری بلدہ صاحب زادہ میر ناصر علی خاں صاحب مددگار محکمۂ وضع قوانین، ڈاکٹر میر سیادت علی خاں صاحب پروفیسر قانون جامعہ عثمانیہ، مولوی افضل الدین فاروقی صاحب بیرسٹر منصف، مولوی معین الدین انصاری صاحب بیرسٹر مولوی عبدالرؤف صاحب وکیل، تاجروں میں مولوی سید عبدالرزاق صاحب اور وزیر سلطان صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو اپنے اپنے دائرۂ عمل میں نہایت کامیاب اور دوسروں کے لئے باعث تقلید ثابت ہوئے ہیں۔

یہ اور اُن کی جیسی دوسری متعدد شخصیتوں کا ذکر اس سالنامہ میں احتیاط کے ساتھ شایع ہوگا بشرطیکہ اس قسم کے حضرات انکساری سے کام نہ لیں، اور اپنے حالات انجمن طلبۂ قدیم کی مجلس انتظامی میں داخل کردیں۔

۳

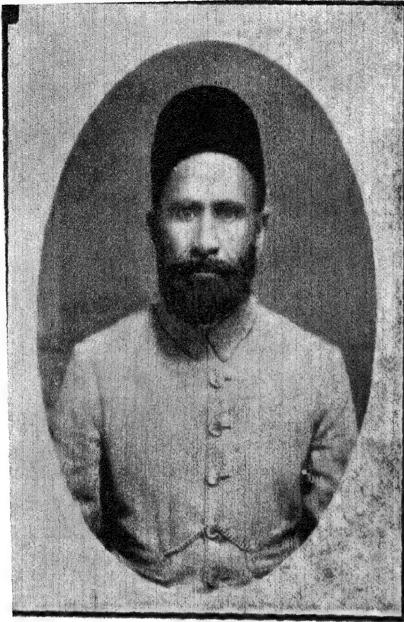
موجودہ معلومات کی حد تک قدیم ترین طلبہ میں سے میر احمد علی خاں صاحب کے حالات دستیاب ہوئے ہیں جو غلام رسول خاں مرحوم آصفجاہی کے متعلقین سے ہیں۔ اور "شمبو پرشاد کی کمان" سے متصل مدرسہ دارالعلوم بلدہ کے محاذی اپنے خاندانی مکان میں رہتے ہیں انھوں نے سٹی ہائی اسکول میں چھ سال تعلیم پائی سنہ ۱۸۸۷ء میں سلسلہ مدرسہ کا اسپیشل اپر پرائمری کا امتحان کامیاب کیا۔ سٹی ہائی اسکول ہی میں میٹرک تک تعلیم پانے کے بعد چند سال دفتر صدر محاسبی سرکار عالی میں کارآموز رہے پھر تحصیلداری پر تقرر ہوا۔ یہ خدمت نہایت خوش اسلوبی سے انجام دی، اور عہدہ داران متعلقہ سے اپنی لیاقت اور جفاکشی کی داد حاصل کی۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب ایم اے پی ایچ ڈی صدر شعبہ عربی و فارسی جامعہ الہ آباد

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب نبیرہ مولوی ضامن حسین صاحب مرحوم سابق ناظم اول فوجداری بلدہ سنہ ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ پہلے گلبرگہ کے مدرسہ فوقانیہ میں سنہ ۱۸۹۱ء سے سنہ ۱۸۹۵ء تک زیر تعلیم رہے۔ پھر سٹی ہائی اسکول میں شریک ہوئے اور تین سال یعنے سنہ ۱۸۹۸ء تک یہیں تعلیم پائی۔ سنہ ۱۸۹۹ء میں قریب قریب ایک سال چادرگھاٹ ہائی اسکول میں بھی زیر تعلیم رہے۔



ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی ام ۔ اے پی ایچ ڈی
صدر شعبہ عربی و فارسی جامعۂ الہ آباد



مولوی میر احمد علی خان صاحب



مولوی مرزا محمد علی بیگ صاحب ام ۔ اے، ڈی ایف، سی
نائب ناظم جنگلات



نواب شہید یار جنگ بہادر
مددگار صدر محاسب

حیدرآباد میں تعلیم ختم کرکے علی گڈھ کالج میں داخل ہوئے جہاں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۷ء تک تعلیم پائی۔ بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۱ء تک محکمہ تعلیمات ممالک متوسط میں ملازمت اختیار کرلی مگر اس اثناء میں ام اے کی تیاری شروع کردی تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۲ء تک ام اے اور اس کے ساتھ رسرچ کا کام کرتے رہے۔

ام اے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا کے وظیفہ سے عربی کی تکمیل کے لئے ۱۹۱۲ء میں جرمنی تشریف لے گئے اور وہاں ۱۹۱۹ء تک اشتراس برگ اور گوٹنگن کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی۔ ۱۹۱۹ء میں ڈاکٹر اف فلاسفی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی جسکی سند ۱۹۱۹ء میں گوٹنگن یونیورسٹی سے اعلیٰ اعزاز کے ساتھ عطا ہوی۔

ہندوستان واپس ہونے کے بعد پہلے آٹھ ماہ تک یعنے فروری ۱۹۲۰ء سے ستمبر ۱۹۲۰ء تک علی گڑھ کالج میں عربی کے پروفیسر رہے اور پھر جامعہ عثمانیہ میں صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ کی جلیل القدر خدمت چار سال یعنے ستمبر ۱۹۲۰ء سے ستمبر ۱۹۲۴ء تک انجام دیتے رہے اور چونکہ اس زمانہ میں جامعہ اپنے عہد طفولیت میں تھی اس لئے اس تشکیل وارتقاء میں انہوں نے بھی خاطرخواہ ہاتھ بٹایا۔ اسی زمانہ میں انجمن طلبۂ قدیم سٹی کالج کی صدارت بھی آپ کے تفویض کیگئی تھی۔ نومبر ۱۹۲۴ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی واسلامیات کی صدارت کا جائزہ لیا۔ اور اکتوبر ۱۹۲۸ء تک بوجوہ احسن انجام دیا۔ آخرکار اس سال نومبر ۱۹۲۸ء میں الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی کی صدارت پر منتقل ہوئے، اور اب تک وہیں سرگرم کار ہیں۔

الہ آباد میں جب سرکار نے ہندستانی اکیڈیمی قایم کی تو اسکی تشکیل و انتظام میں بھی ڈاکٹر صاحب کے مشورے حاصل کئے گئے۔ چنانچہ وہ اب تک اسکے نہایت سرگرم رکن ہیں۔

ڈاکٹر صدیقی کو اردو زبان سے خاص شغف ہے۔ چنانچہ اسکے لسانی پہلوؤں، قواعد اور املا کے متعلق ان کے متعدد مضامین شایع ہوچکے ہیں۔ ہندستانیوں اور خاصکر مسلمانوں میں ماہرین لسانیات کی ناگفتہ بہ کمی ہے اور اس خصوص میں ڈاکٹر صدیقی ایک غیرمعمولی شخصیت ہیں۔

مولوی سیّد خورشید علی صاحب ناظم دفتر دیوانی و مال و ملکی و استیفا وغیرہ

مولوی سیّد خورشید علی صاحب ۴ محرم ۱۳۰۴ھ مطابق ۳ اکتوبر ۱۸۸۶ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے نام "سیّد خورشید علی" ہی سے انکا سالِ ولادت ظاہر ہوتا ہے ابتدائی تعلیم مکان ہی پر حاصل کی اور پھر نواب شمس الامرا بہادر کے مشہور آفاق "مدرسہ فخریہ" میں شریک ہوئے جو حیدرآباد کے قدیم ترین اعلیٰ مدارس میں سے ہے مگر افسوس ہے کہ آجکل اسکی حالت نہایت سقیم ہوگئی ہے۔ انگریزی تعلیم کے لئے بعد میں گورنمنٹ ہائی اسکول سٹی ہائی اسکول اور نظام کالج میں بھی شریک رہے اور ہر جگہ اپنے اعلیٰ کردار اور خاص علمی ذوق کی وجہ سے اپنے ہم چشموں میں ممتاز رہے۔

یکم آذر ۱۳۱۹ف سے دفتر معتمدی فینانس میں ملازمت اختیار کرلی اور تدریجی ترقی حاصل کرتے رہے آخرکار مسٹر گلانسی نے ان کی پرخلوص محنت، ذوق علم و فضل اور اعلےٰ کردار سے واقف ہوکر ایک نئی جائداد پرسنل اسسٹنٹ کی قائم کی اور اس پر آپ کو مامور کیا۔ بعد میں ۱۳۲۵ف سے آپ ناظم دفتر دیوانی و مال و ملکی وغیرہ مقرر ہوئے اور نہایت خوش اسلوبی سے اپنے مہتم بالشان محکمہ کی تنظیم و ترقی میں منہمک ہیں۔ چونکہ محکمۂ فینانس کے صیغۂ فرمان سے ابتدا ہی سے تعلق رہا ہے اس لئے عہد حاضر کی متحرک تاریخ سمجھے جاتے ہیں۔

اپنے زمانہ طالب علمی ہی سے سید خورشید علی صاحب کو انشا پردازی اور تصنیف و تالیف کا سنجیدہ ذوق رہا ہے۔ چنانچہ اٹھارہ سال کی عمر ہی سے ہندستان و دکن کے اکثر موقر رسائل میں علمی و ادبی مضامین شایع کرنے شروع کردیئے تھے اور اتنی کم سنی ہی میں اردو کے بڑے بڑے مصنفین و مولفین سے اپنی انشاپردازی کی داد حاصل کی۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم کو اس نوجوان اہل قلم سے خاص خلوص تھا اور اُن کے زمانۂ قیام حیدرآباد میں یہ اکثر ان کی صحبت سے مستفید ہوئے ہیں۔

مولوی سید خورشید علی صاحب نے ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۰ء تک (یعنے بیس سال کی عمر سے پیشتر) جو بیس پچیس مضامین لکھے اور شایع کئے ان کے عنوانات پر ایک نظر ڈالنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی تعلیم و اصلاح سے خاص دلچسپی رہی ہے۔ اردو زبان میں صنف نازک کے متعلق بہت کم مضامین یا کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور مولوی

سید خورشید علی صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے آج سے چوبیس سال قبل ہی اس ضرورت کو محسوس کیا اور اردو زبان کی اس زبردست کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی۔

اس زمانہ میں انہوں نے جاپان سے متعلق ایک انگریزی کتاب کا بھی ترجمہ کیا جو بہت مقبول ہوا چنانچہ آج سے پچیس سال قبل اس کے متعلق رسالہ ادیب (بابت اگسٹ ۱۹۰۹ء) میں لکھا گیا ہے کہ:-

"ہم بڑی خوشی سے ناظرین کو اطلاع دیتے ہیں کہ ہمارے خاص کرم فرما جناب مولوی سید خورشید علی صاحب نے جن کا نام نامی ناظرین ادیب کیلئے خصوصاً اور اردو رسائل و اخبارات کے ملاحظہ فرمانے والوں کیلئے عموماً کسی معرفی کا محتاج نہیں ہے ایک بہت اعلیٰ درجہ کی دلچسپ انگریزی کتاب کا نہایت سلیس اور بہت عمدہ ترجمہ ادیب میں سلسلہ وار شایع کرنے کے لئے مرحمت فرمایا ہے"

اسی کتاب کے متعلق علی گڈھ کے رسالہ خاتون نے مترجم کی محنت و خلوص اور ترجمہ کی خوبی کے متعلق اپنے رسالہ میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"ہمارے مکرم اور مہربان دوست اور خاتون کے خیرخواہ اور محسن مولوی سید خورشید علی صاحب کی مفید اور دلچسپ کتاب جاپان کا یہ آخری باب تھا، اب یہ کتاب ختم ہوگئی خواتین نے جس دلچسپی کے ساتھ اسکو پڑھا ہے اسکا تمام کریڈٹ سید صاحب موصوف کے دلکش طرز تحریر اور ان کے مفید انتخاب کو ہے...... سید صاحب نے اس کو اس عمدگی کے ساتھ لکھا ہے کہ ترجمہ کا شبہ اس پر نہیں ہوتا...... ایک مستقل تصنیف معلوم ہوتی ہے ...... سید صاحب کی اس عنایت اور مہربانی کے شکرگزار ہیں..... ہم یہ خوب جانتے ہیں کہ سید صاحب جس دلی جوش کے ساتھ تعلیم نسواں کیلئے کوشش کر رہے ہیں اور اس حیثیت سے انہوں نے ہمارے صنیعہ اور خاتون کی خدمت کی ہے وہ یقیناً کسی شکریہ سے مستغنی ہے لیکن ہم اگر انکا شکریہ ادا نہ کریں تو یہ ایک قسم کی احسان فراموشی ہے سید صاحب موصوف نے ازراہ قومی ہمدردی اس کتاب کا حق ترجمہ زنانہ نارمل اسکول علی گڈھ کو عطا فرمادیا ہے اور ہماری اس ممنونیت کو بھی انہوں نے اپنے احسان سے خالی نہ چھوڑا..... انشاءاللہ جلد یہ کتاب دفتر خاتون سے نہایت نفاست کے ساتھ چھپوا کر شایع کی جائے گی"

اس کتاب کے علاوہ مولوی سید خورشید علی صاحب نے مسز سروجنی نائیڈو کی ایک انگریزی کتاب کا بھی ترجمہ کیا جو "گوکھلے من حیث الانسان" کے نام سے شایع ہوئی۔

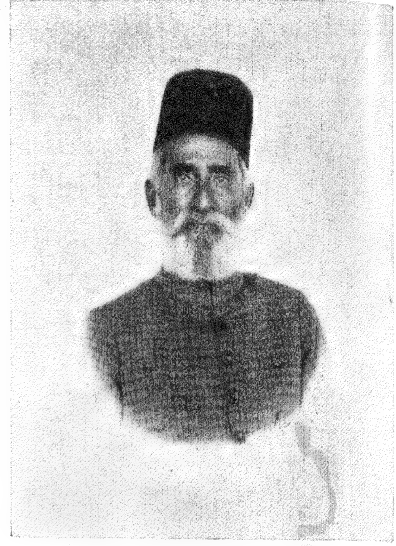
۱۹۱۰ء کے بعد سے ۱۹۲۲ء تک مولوی سید خورشید علی صاحب نے اور متعدد مضامین شایع کئے جن کے

عنوانات ظاہر کرتے ہیں کہ بعد میں مصنف کو عورتوں کی فلاح و بہبود سے متعلق موضوعوں کے علاوہ تاریخ سے بھی خاص دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ عہد حاضر میں حیدرآباد میں مولوی سید خورشید علی صاحب جیسی عام تاریخی معلومات کسی اور شخص کو حاصل نہیں ہے۔

علمی و ادبی خدمات کے ساتھ مولوی سید خورشید علی صاحب کی سماجی اور معاشرتی خدمات کا ذکر بھی ضروری ہے کیوں کہ اب وہ حیدرآباد کی معاشرتی اور سماجی زندگی ہی کی اصلاح و تنظیم میں بہت زیادہ منہمک ہیں۔ دفتری انتظام کے علاوہ کئی قومی اور تعلیمی اداروں مثلاً نظام کلب، حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس، فری میسن لاج، انجمن اسلامیہ، بیت المعذورین، نظام وا لنٹیر کور، انجمن طلبا قدیم سٹی کالج وغیرہ کے انتظامات زیادہ تر انہیں کے سپرد ہیں، کئی ادارے ایسے بھی ہیں جو انکی سرپرستی یا امداد و مشورے کے بغیر زندہ نہ رہ سکتے، یہی وجہ ہے کہ چند سال سے ان کو لکھنے کا موقع کم مل رہا ہے، یوں بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود لکھنے کی جگہ اب وہ لکھنے والوں کی سرپرستی اور امداد کی طرف مائل ہیں۔ حیدرآباد کے متعدد نوجوان انشا پردازوں کی قدر دانی اور ہمت افزائی کی ہے اور سب انکے وسیع اخلاق اور ایثار کے معترف ہیں۔

مولوی سید ہاشم علی خانصاحب بی اے ایچ سی ایس ناظم اول فوجداری بلدۂ حیدرآباد دکن

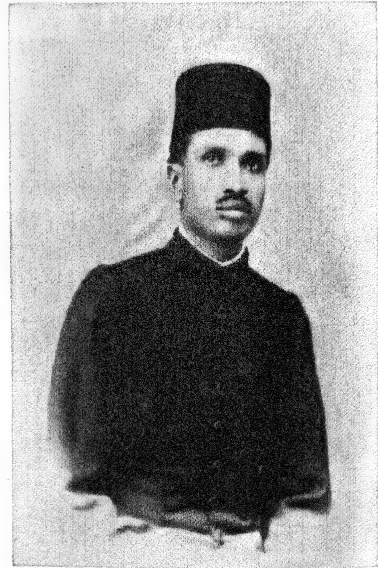
مولوی سید ہاشم علی خاں صاحب خلف میر محبوب علی خاں نبیرۂ ترکتاز جنگ مرحوم ۱۳۰۱ف میں پیدا ہوئے انکے اجداد سید لشکر خاں رکن الدولہ اور رفعت الملک ہمراہ رکاب سعادت اعلحضرت نواب آصفجاہ بہادر دہلی سے وارد حیدرآباد ہوئے۔ فوجی و ملکی خدمات کے صلہ میں جاگیرات اور مناصب عالیہ سے سرفراز رہے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ اور سٹی ہائی اسکول میں ہوئی ۱۹۰۵ء میں مڈل کا امتحان سٹی ہائی اسکول سے کامیاب کیا بمبئی یونیورسٹی سے ۱۹۱۲ء میں گراجویٹ ہوئے سیول سروس میں ۱۹۱۳ء میں انتخاب ہوا دو سال تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد حصول معلومات کے لئے الہ آباد بھیجے گئے واپسی پر خدمت منصفی پر تقرر ہوا کچھ دنوں قحط میں بحیثیت اسپشل ریلیف افسر کام کرتے رہے۔ ۱۳۳۰ف سے اضلاع عثمان آباد، عادل آباد



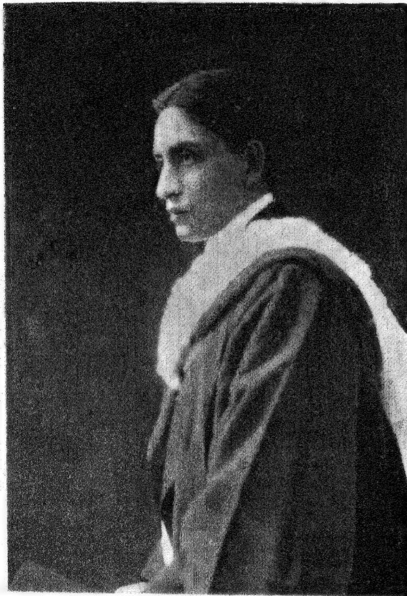
مولوی سید عبدالغفور صاحب مددگار سٹی کالج



مولوی میر ہاشم علی صاحب بی۔اے ایچ سی ایس
صدر ناظم عدالت صوبۂ ورنگل



صاحبزادہ میر نادر علی صاحب بی۔اے۔ال ال۔بی
بیرسٹرایٹ لا مددگار معتمد وضع قوانین



مولوی معین الدین صاحب انصاری بی۔اے بیرسٹرایٹ لا
وکیل عدالت عالیہ حیدرآباد دکن

گلبرگہ، ناندیڑ، رائچور پر ناظم عدالت ضلع رہے تقریباً تین سال تک معتمدی عدالت العالیہ کا کام انجام دیا گزشتہ تین سال سے ناظم اول فوجداری بلدہ ہیں۔ اپنے اچھے کام کی وجہ سے نیک نام ہیں اور ملک کے قابل قدر افراد میں شمار کئے جاتے ہیں۔

مولوی سید عبدالرزاق صاحب مالک سید عبدالرزاق اینڈ کمپنی کیمسٹ خاص حیدرآباد دکن

مولوی سید عبدالرزاق صاحب ۱۳۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔ مشرقی علوم میں ابتدائی تعلیم بارہ سال کی عمر تک گھر ہی میں حاصل کی پھر کچھ عرصہ گرامر اسکول میں تعلیم پانے کے بعد سٹی ہائی اسکول میں شریک ہوئے اور یہاں چند سال تک زیر تعلیم رہکر تحصیل فن میں دلچسپی لی۔ مدراس میڈیکل کالج کے کیمسٹ اینڈ ڈرگسٹ کلاس میں شریک ہوئے فن کیمسٹری میں ڈاکٹر اگھورناتھ صاحب ڈی۔ اس۔ سی کے شاگرد ہوئے یہاں سے فارغ ہوکر برکات عثمانیہ المعروف مخزن ادویہ جدیدہ کی تالیف کی جس کی ضخامت چودہ سو صفحات کی ہے یہ کتاب فنی حیثیت سے بہت مقبول عوام ہوئی۔ ملک کے مشاہیر نے اس کے متعلق قیمتی تقاریظ لکھیں۔ برکات عثمانیہ کی طباعت کے بعد اپنے تجارتی کاروبار کو ترقی دینے کی طرف توجہ کی ایک معمل لیبوٹری کے قیام کی مساعی میں کامیاب ہوئے اور برٹش فارما کوپیا کے مرکبات کی تیاری شروع کی اس وقت انکی لیبوٹری میں الکحل آمیزہ تمام دوائیں بنائی جارہی ہیں جنکی معالجین کو بکثرت ضرورت ہوا کرتی ہے۔ انہوں نے متعدد پیٹنٹ دوائیں بھی ایجاد کیں جو اس وقت تک رائج ہیں ان میں سے پلیگن (دوائے پلیگ) انفن ٹون (محافظ صحت اطفال) وغیرہ قابل ذکر ہیں ان ادویہ کی اشاعت کیلئے ایک خاص عملہ مقرر کیا گیا اور رسالہ پرورش اطفال، رسالہ انفلوئنزا، رسالۂ پلیگ، جیسے مفید ناشرات طبی ہزاروں کی تعداد میں طبع کرکے مفت تقسیم کئے۔ جڑی بوٹیوں کی تحقیقات اور اس سے مفید نتائج حاصل کرنا ان کا دلچسپ ور اولین مشغلہ رہا ہے چنانچہ نباتات کے باغات دیکھنے کے شوق میں تمام ہندوستان کا سفر کیا بمبئی کلکتہ، مدراس، لکھنؤ سہارنپور وغیرہ ہر جگہ کے باغ ہائے نباتات کا تحقیقی معائنہ کیا۔

کلکتہ کے میوزیم کے معائنہ اور اپنا ذاتی میوزیم قائم کرنے کے سلسلہ میں تین ماہ تک کلکتہ میں اقامت اختیار کی اور حیدرآباد آکر اعلیٰ حضرت خسرو دکن خلد اللہ ملکہ سلطنتہ کی اپنی کمپنی میں تشریف آوری کی یادگار میں مختصر پیمانے پر ایک میوزیم (عجائب خانہ طبی نباتات) قائم کیا جس میں بہترین طبی نباتات کے نمونے جمع کئے گئے ہیں اور میوزیم سے متعلق ایک کتب خانہ کی بھی بنیاد ڈالی ہے اس میں علم الادویہ اور کیمیکل سائنس اور اورٹکنالوجی اور دیگر فنوں کی بزبان انگریزی بیش قیمت کتابیں مہیا کی گئی ہیں۔ میوزیم اور کتبخانہ سے طالبان علم اور شایقین فن کافی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور انکی کمپنی نہایت دیانت اور محنت کے ساتھ اہل حیدرآباد کو فائدہ پہنچا رہی ہے۔

مولوی مرزا محمد علی بیگ صاحب ایم اے ڈی ایف (آکسن) نائب ناظم جنگلات

مرزا محمد علی بیگ صاحب حیدرآباد کے ایک مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، انکے والد مرزا حسینی بیگ صاحب نبیرۂ نواب نصیر الملک جاگیردار نصر اللہ آباد ضلع محبوب نگر تھے اور انکی والدہ نبیرۂ لطف علی جاگیردار کنڈن پلی ضلع اطراف بلدہ تھیں۔ انہوں نے ابتداً سٹی ہائی اسکول میں مڈل تک تعلیم پائی۔ وہاں سے گورنمنٹ ہائی اسکول میں میٹرک تک تعلیم پاکر کامیابی حاصل کی اس کے بعد نظام کالج میں انٹرمیڈیٹ اور بی اے تک مضمون اختیاری سائنس لیکر تعلیم پائی۔ جب یونیورسٹی کمیشن نے لبارٹری (معمل) میں کافی سامان تعلیم و تجربہ وغیرہ نہ ہونے کی وجہ سے بی اے میں سائنس کی تعلیم کو برخاست کردیا تو سرکار سے وظیفہ حاصل کرکے پریسیڈنسی کالج مدراس میں شریک ہوئے بی اے کے امتحان میں درجۂ اول میں کامیاب ہوئے اور تمام مدراس پریسیڈنسی میں ان کا نمبر دوسرا رہا۔ ان سے پہلے جامعہ مدراس میں کسی مسلمان نے اس مضمون میں امتحان نہیں دیا تھا۔ سائنس کے ساتھ مرزا محمد علی بیگ صاحب کو السنہ شرقیہ سے بھی دلچسپی رہی ہے۔.......

ہندستان میں تعلیم ختم کرکے سرکار سے وظیفہ تعلیم یورپ حاصل کرکے فن جنگلات کی تعلیم کیلئے جامعہ آکسفورڈ میں شریک ہوئے۔ وہاں علمی تعلیم اور جرمنی فرانس و سوئزرلینڈ میں عملی تعلیم کا ڈپلوما حاصل کیا آخرکار

ارضیات میں بی اے کی آنرس ڈگری حاصل کرکے حیدرآباد واپس ہوے۔ یہ ایک دفعہ حیدرآباد آکر پھر اپنی بیوی کے ساتھ یورپ روانہ ہوئے تھے اور اس دفعہ تین سال قیام کیا۔

یورپ سے واپس ہونے کے بعد برطانوی ممالک متوسطہ میں علمی اور دفتری تجربہ حاصل کیا اور ۱۳۲۲ف میں خدمت مددگاری جنگلات پر مامور ہوئے۔ بعد میں ۱۳۳۲ف سے خدمت نائب نظامت جنگلات پر کارگزار ہیں۔ ان کا علمی شغف ابتک جاری ہے۔ چنانچہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے لئے اپنے فن ارضیات کی دو اعلیٰ انگریزی کتابوں کا اردو میں نہایت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ انہیں وضع اصطلاحات سے بھی خاص دلچسپی ہے۔ چنانچہ ارضیات سے متعلق نہایت مفید اصطلاحیں وضع کی ہیں اور ان کیلئے اصول بھی مدون کئے ہیں۔

صاحبزادہ میر ناصر علی صاحب بی اے ال ال بی بیرسٹرایٹ لاء مددگار محکمۂ قانونی

مولوی ناصر علی صاحب کی زیادہ تر ابتدائی تعلیم سٹی ہائی اسکول ہی میں ہوئی چنانچہ وہیں سے ۱۹۱۴ء میں اسکول فائنل کا امتحان کامیاب کیا اور پھر اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے نظام کالج میں شریک ہوئے مدراس یونیورسٹی کے بی اے کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد حسب فرمان خسروی مجلس عالیہ عدالت میں بحیثیت کارآموز بمشاہرہ تین سو الاونس مامور کئے گئے۔ اور ۱۳۳۰ف کا واقعہ ہے تخمیناً ۹ ماہ عدالت العالیہ میں کام کرنے کے بعد انہیں قانونی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بعطائے وظیفہ ولایت بھیجا گیا تین سال وہاں قیام رہا۔ لندن یونیورسٹی سے یل یل بی اور مڈل ٹمپل سے بیرسٹر ہوئے واپسی کے بعد آذر ۱۳۳۴ف میں مددگاری محکمۂ قانونی پر حسب فرمان خسروی مقرر کئے گئے جس پر ابتک کارگزار ہیں ۱۳۳۵ف میں تخمیناً دو ماہ ۱۳۴۰ف اور ۱۳۴۱ف میں تقریباً ایک ایک ماہ بحیثیت نگرانکار مشیر قانونی دفتری کام انجام دیا ہے۔ اپنی اعلیٰ قانونی معلومات اور اعلیٰ کردار کی وجہ سے ریاست کے قابل ذکر عہدہ داروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

مولوی غلام قادر صاحب بی اے نائب صدر نظام کالج

مولوی غلام قادر صاحب ۱۹۰۶ء کے آخر میں سٹی کالج میں مسٹر راس کے زمانہ صدارت میں پرائمری میں شریک ہوئے اور ۱۹۱۵ء میں ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کا امتحان پاس کیا پھر کچھ دن نظام کالج میں شریک ہوکر تعلیم پائی لیکن ہائی اسکول ہی کی تعلیم کے دوران میں ان کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے کالج کا سلسلہ تعلیم چھوڑ کر سٹی ہائی اسکول ہی میں ملازمت اختیار کرلی۔ نیز تو ملازمت کے لئے مالگزاری میں بھی کوشش کی تھی چنانچہ مسٹر ویکفیلڈ صدر ناظم مال نے سرسری طور پر امتحان لیکر کہا کہ فی الوقت پچاس روپئے کی پیشکاری قبول کرلیں۔ چونکہ یہ عہدہ داران مال کا امتحان کامیاب نہیں ہیں اس لئے تحصیلداری نہیں دیجاسکتی لیکن مولوی صاحب نے پچاس کی پیشکاری پرتیس روپئے کی مدرسی کو بوجوہ خاص پسند کیا۔

سٹی ہائی اسکول میں انکی خاص کارگزاری اور مسلسل عمدہ نتائج تعلیم کو دیکھ کر بی اے کا انتہائی گریڈ ۵۰ تا ۱۰۰ پر ترقی مل گئی۔ زمانہ ملازمت میں بھی اعلی التعلیم کا خیال رہا چنانچہ انٹرمیڈیٹ کا امتحان ۳۰ف میں اور بی۔ اے کا ۳۲ف میں کامیاب کیا۔ ۳۰ف میں امتحان عہدہ داران مال بہ استثنائے زبان ملکی بدرجہ اعلی کامیابی حاصل کی ۳۲ف میں جب سٹی کالج میں انٹرمیڈیٹ کی کلاس قائم ہوئی تاریخ انگلستان کے لئے چند ساعتی لکچرار کی حیثیت سے کام کرنے لگے ۳۳ف میں مستقلاً ۱۰۰ تا ۱۴۰ کا گریڈ ملا۔ ۳۶ف میں تپ دق میں مبتلا ہوکر مدن پلی گئے۔ وہاں سے لوٹنے کے بعد آذر ۳۹ف سے مددگاری سٹی کالج پر منتقل ہوکر کارگزار رہیں۔

۳۳ف میں ایک طویل سلسلہ منصرمی پر تحصیلدار ہوئے مگر طبیعت کے موزوں نہ ہونے کی وجہ سے خود ہی منصرمی سے سبکدوش ہوئے۔

ان سب متذکرہ حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی غلام قادر صاحب نے دوسرے محکموں کی اعلیٰ خدمات پر درس و تدریس کی خشک خدمت ہی کو ترجیح دی۔ وہ علم کا سچا ذوق رکھتے ہیں اور

درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف میں بھی وقت صرف کرتے ہیں چنانچہ مضامین کے علاوہ جغرافیہ دکن مرتب کیا جو مدارس سرکار عالی کے نصاب میں شامل ہے۔ ان علمی خدمات کے علاوہ سٹی کالج جیسی اہم اور بڑی درسگاہ کے جملہ انتظامات میں صدر صاحب کے دست راست ہیں طالب علموں کی امداد اور اعانت سے کبھی دریغ نہیں کرتے چنانچہ انجمن معاون طلبہ کے نائب صدر اور روح رواں ہیں۔

مولوی غلام قادر صاحب حقیقی معنوں میں سٹی کالج کے ایک قدیم طالب علم ہیں انکی ساری عمر اسی درسگاہ میں گذری اپنی تعلیم کی تکمیل تک اس درسگاہ کے علاوہ انہوں نے کسی اور مدرسہ کی غالباً صورت تک نہیں دیکھی اور ختم تعلیم کے بعد بھی آج تک اسی درسگاہ میں مصروف درس و تدریس ہیں اسی قسم کے مستقل مزاج اور باہمت اصحاب کے لئے مرزا غالب نے لکھا ہے کہ

وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے۔

مولوی محمد معین الدین صاحب انصاری بی اے بیرسٹر اٹ لا

انصاری صاحب کے والد مولوی غیاث الدین صاحب مرحوم بلدہ کے ایک مشہور اور ممتاز وکیل تھے نہ صرف وہ سٹی ہائی اسکول کے پرانے طلباء میں ہیں بلکہ ان کے والد بھی کسی زمانے میں اسی درسگاہ کے متعلم تھے یہاں وہ سنہ ۱۹۰۸ء اور سنہ ۱۹۰۹ء میں دوسری اور تیسری جماعت میں شریک تھے اسکے بعد صحت کی خرابی کی بناء پر اسکول چھوڑ دیا۔ اور پھر ایک مدت تک گھر پر عربی اور انگریزی کی تحصیل کی آخرکار والدین سے جدا ہوکر شمالی ہند کی مختلف درسگاہوں سے کامیابی کے ساتھ استفادہ کرتے رہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں انگلستان گئے اور ۳ سال کیمبرج یونیورسٹی میں "علوم اخلاقیہ" (یعنے فلسفہ وغیرہ) کی تحصیل کی آنرس کا امتحان دیا منطق میں یونیورسٹی میں اول آئے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں ڈگری لی۔ اسی سال رائل ایشیاٹک سوسائٹی لنڈن کے رکن منتخب ہوکر وہاں کی علمی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیتے رہے۔ اس اثناء میں مڈل ٹمپل لنڈن میں قانون کی تعلیم بھی حاصل کررہے تھے جہاں سے سنہ ۱۹۲۳ء میں بیرسٹری کی سند حاصل کی اور عملی کاروکالت

سیکھا اور اکثر ممالک یورپ کی سیاحت کے بعد واپس آئے۔

یورپ سے واپسی پر انہوں نے ایک اہم انگریزی تصنیف کا ترجمہ "مسائل فلسفہ" کے نام سے کیا جو جامعہ عثمانیہ نے شایع کر کے اپنے بی اے کے نصاب میں داخل کیا ہے۔ اسی ضمن میں یونیورسٹی کی ملازمت بھی دی جا رہی تھی جسے منظور نہ کیا اور پیشۂ آبائی کی طرف متوجہ ہوئے۔ الہ آباد ہائیکورٹ کے اڈوکیٹ کی حیثیت سے لکھنو میں پراکٹس کرتے رہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں انکو ہز ہائی نس نواب رامپور نے اپنے ہائیکورٹ کی رکنیت پر مقرر کیا۔ جہاں ڈھائی سال تک وفاداری اور ہر دل عزیزی سے کام کرتے رہے اس اثنا میں جب اعلیحضرت خسرو دکن خلد اللہ ملکہ کا رامپور میں ورود مسعود ہوا تو شاہی مہمانداری کے خاص انتظامات کیلئے نظر انتخاب انہی پر پڑی اور اُن کو خاص ملازمت شاہی کا فخر حاصل ہوا۔

بالآخر رامپور کی آب و ہوا موافق نہ آئی اور انصاری صاحب پھر اپنے خاندان سے آملنے پر مجبور ہوئے۔ چنانچہ بلدہ میں رہکر اب اپنے پیشۂ آبائی میں نام پیدا کر رہے ہیں۔

مولوی نادر اسمٰعیل مرزا صاحب مہتمم کروڑ گیری

مولوی نادر اسمٰعیل مرزا صاحب کا خاندان نادر شاہ افشار سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ اُن کے دادا اسمٰعیل مرزا صاحب نے قاچاریوں سے شکست پاکر جب ہندستان کا رخ کیا تو حیدر آباد ہی جائے پناہ معلوم ہوئی اس لئے دکن کا رخ کیا۔

حیدر آباد پہنچنے پر جنرل فریزر رزیڈنٹ اور اُن کے مددگار کپتن مالکم نے اسمٰعیل مرزا کی زندگی تک اکہتر روپیہ وظیفہ کرادیا اور تا زیست وہ اور انکی خاتون محترمہ رزیڈنسی سرحد کے مکان میں رہے بعد وفات رزیڈنسی ٹاور کے قریب دفن کئے گئے۔

اسمعیل مرزا کے فرزند عظیم علی شاہ کی پرداخت مالکم صاحب نے اپنی نگرانی میں کی کہ مالکم صاحب کے بزرگ عرصہ تک ایران میں سفیر رہ چکے تھے۔

عظیم علی شاہ کو سرکار عالی سے معقول منصب عنایت فرمایا گیا جو اب تک خاندان میں جاری ہے۔

عظیم علیشاہ نے اسد اللہ مرزا شیرازی کی صاحبزادی سے شادی فرمائی جن کے بطن سے بہرام علیشاہ تولد ہوئے اور حیدرآباد میڈیکل کالج میں تعلیم پائی اور اپنی تمام زندگی سرکار عالی کے سلسلۂ ملازمت میں بسر کی اضلاع پر کارگزار رہے۔

بہرام علی شاہ کے فرزند اسمٰعیل مرزا منصبدار سٹی ہائی اسکول کے قدیم متعلم ہیں اور بعد ختم تعلیم ملازمت سرکار عالی میں داخل ہوئے عرصہ تک برٹش انڈیا میں سررشتہ کروڑگیری کی تعلیم پائی۔ اب سررشتہ کروڑگیری میں مہتمم ہیں۔

مولوی مرزا احمد اللہ بیگ صاحب

مولوی احمد اللہ بیگ صاحب۔ مرزا مصطفٰے بیگ صاحب ناظم نظم جمعیت کے بھتیجے ہیں سنہ ۱۹۰۵ء سے سنہ ۱۹۱۱ء تک سٹی ہائی اسکول میں تعلیم پائی۔ بعد ختم تعلیم سنہ ۱۹۲۱ء سے رسالہ ادیب الاطفال جاری کیا جو ملک میں بچوں کا غالباً پہلا رسالہ ہے۔ اس رسالہ کو مرزا صاحب خاص محنت اور مستعدی کے ساتھ برابر دو سال تک نکالتے رہے سنہ ۱۹۱۸ء سے ملازمت میں داخل ہوئے۔ مددگاری معتمد مال، تحصیلداری اور اول تعلقداری وغیرہ کی خدمات دیانت اور محنت سے انجام دیتے رہے ہیں۔

مولوی میر محمود علی صاحب نائب کوتوال بلدہ

مولوی محمود علی صاحب حیدرآباد کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو منصب اور جاگیر سے سرفراز ہے اور جس میں میر اشرف علی صاحب اور خلیفہ شاہ سعد اللہ صاحب جیسی بزرگ ہستیاں گزری ہیں۔ انکی ابتدائی تعلیم علوم مشرقیہ مکان ہی پر ہوئی اور السنہ عربی و فارسی کی تکمیل کے بعد سٹی کالج میں شریک ہوئے یہاں سے فارغ ہو کر نظام کالج میں بھی تعلیم پائی وکالت اور جوڈیشل کے امتحانات بھی بدرجۂ اعلیٰ کامیاب کئے اور عہدہ داران مال کے امتحان میں بھی اعزاز حاصل کیا۔ ختم تعلیم و امتحانات کے بعد پائیگاہ میں تحصیلداری کی

خدمت پر مامور ہوئے اور اس خوبی سے کام کیا کہ ضلع محبوب نگر کے محکمۂ لوکل فنڈ کے مہتمم بنائے گئے۔ بعد میں رکن عالی میں تحصیلداری کی خدمت پر منتقل ہوئے اور اس حیثیت سے عہدہ داران بالا پر اپنی قانونی اور علمی قابلیت کا سکہ بٹھایا۔ ان کی قابلیت اور مستعدی کا شہرہ سنکر کوتوال وقت نواب عماد جنگ ثانی مرحوم نے انہیں اپنے محکمۂ پولیس میں اعلیحضرت کی خاص منظوری حاصل کرکے عہدۂ مہتممی پر مستقل کرلیا۔ پولس کے فرائض کے علاوہ مولوی محمود علی صاحب کے تفویض "سررشتہ بازارات صرفخاص مبارک" بھی کیا گیا۔ کیونکہ اس میں لاکھوں روپئے وصول طلب تھے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے بہت جلد سب قرضہ جات اور وصول طلب رقمیں وصول کرلیں اور سررشتہ کی حالت بھی درست کردی۔

مولوی صاحب نے پرنس آف ویلز کے ورود حیدرآباد کے زمانہ میں اپنے کارنمایاں سے خاص خراج تحسین حاصل کیا چنانچہ ایک طلائی تمغہ کے علاوہ ۵۰ روپئے کا ماہوار الاؤنس بھی ان کی تنخواہ کے ساتھ بطور انعام جاری ہوا۔ اس زمانہ میں وہ مددگار کوتوال بھی بنائے گئے اور پھر نائب کوتوالی کے جلیل القدر عہدہ پر ترقی پائی اور ساتھ ہی محکمۂ خفیہ پولس ان کے تفویض کیا گیا۔ ایسی اہم خدمت کو وہ اب تک نہایت جانفشانی اور ملک و مالک کی وفاداری کے ساتھ انجام دے رہے ہیں اور محکمۂ پولس میں بہت نیک نام ہیں۔

مولوی عبدالقیوم خاں صاحب بی اے بی ایس سی (مینچسٹر) انجنیر تعمیرات جامعہ عثمانیہ نائب صدر انجمن طلبائے قدیم سٹی کالج

مولوی عبدالقیوم خاں صاحب ۱۹۰۰ء میں بمقام حیدرآباد پیدا ہوئے۔ سٹی ہائی اسکول سے ۱۹۱۸ء میں میٹرک کا امتحان کامیاب کیا اور اول آئے چنانچہ کھلے اسکالرشپ حاصل کیا۔ اسکے بعد علی گڈھ سے ۱۹۲۲ء میں بی اے کی سند حاصل کی اور اعلیٰ التعلیم کے لئے ولایت روانہ ہوئے۔ مینچسٹر یونیورسٹی سے ۱۹۲۶ء میں انجنیرنگ کی ڈگری حاصل کی اثنائے تعلیم میں اپنے نامی کرداری کی وجہ سے مینچسٹر انڈین اسوسی ایشن کے صدر منتخب کئے گئے۔

یورپ سے واپسی پر محکمۂ تعمیرات میں ملازم ہوئے اور اب جامعۂ عثمانیہ کی تعمیر میں انجنیر ہیں۔ روانگی یورپ سے قبل انجمن طلبائے قدیم سٹی ہائی اسکول کے معتمد بھی منتخب کئے گئے اُن کی روانگی کے وقت اُن کو اور اُن کے

ساتھی مولوی فضل الدین صاحب فاروقی بی اے (اکسفورڈ) بیرسٹر کو انجمن کی جانب سے عالیشان عصرانہ بھی دیا گیا تھا۔

مولوی سید محمد صفی صاحب بی اے ال ال بی اہلکار نظامت تعلیمات معتمد انجمن طلبائے قدیم سٹی کالج

مولوی سید محمد صفی صاحب گلبرگہ شریف میں پیدا ہوئے۔ تحتانیہ اور فوقانیہ تعلیم تقریباً سات سال تک سٹی ہائی اسکول ہی میں حاصل کی اور یہیں سے امتحان میٹرک کامیاب کرکے اعلیٰ تعلیم کے لئے کلیہ جامعہ عثمانیہ میں شریک ہوئے جہاں اپنے خاص کردار اور راستبازی کی وجہ سے اپنے ہم چشموں میں ممتاز رہے بی اے اور ال ال بی کے اعلےٰ امتحانات کی کامیابی کے بعد محکمۂ تعلیمات میں ملازمت اختیار کرلی۔ اس سال انجمن طلبہ قدیم معتمد منتخب ہوئے اور نہایت جانفشانی اور خلوص کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دیا

مولوی محمد کریم اللہ خاں صاحب بی اے بی ٹی مددگار سٹی کالج خازن انجمن طلبائے قدیم سٹی کالج

مولوی کریم اللہ خاں صاحب ۵ آذر ۱۳۰۵ف کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں سٹی ہائی اسکول میں شریک ہوئے اور ۱۹۱۵ء میں ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کا امتحان کامیاب کرکے کالج چھوڑا۔ اسکے بعد تقریباً تین سال مدرسہ آصفیہ ملک پیٹھ میں بحیثیت ہوس ماسٹر ملازمت کی اور ۱۸ خورداد ۱۳۲۶ف کو ملازمت سرکاری میں منتقل ہوئے ابتدائی ملازمت سے ابتک سٹی کالج ہی میں متعین ہیں۔ انٹر اور بی اے کا امتحان بطور خانگی امیدوار کامیاب کیا ۱۹۲۹ء میں علی گڈھ سے بی ٹی کا امتحان پاس کیا۔ سٹی کالج میں طبقہ فوقانیہ و وسطانیہ میں ریاضی کی تعلیم دیتے ہیں اور اپنے خاص کردار اور انتظامی قابلیت کی وجہ سے ضرب المثل ہیں۔ مدرسہ اور انجمن کی شاید کوئی تقریب ایسی نہیں ہوتی جس میں خاں صاحب کی بے مثل خوبیوں سے مستفید نہ ہونا پڑتا ہو

مولوی سعید احمد خاں صاحب مددگار سٹی کالج معتمد تفریحات انجمن طلبائے قدیم سٹی کالج

ابتدائی تعلیم سٹی کالج ہی میں شروع ہوئی اور اس کالج کی آخری جماعت الیف اے میں یہیں سے

کامیابی حاصل کی۔ خاں صاحب کا پورا تعلیمی زمانہ تقریباً اسی کالج میں گزرا۔ اگرچہ چند سال کے لئے کلیہ جامعہ عثمانیہ میں بھی شریک رہے۔ اُن کا ہائی اسکول کا زمانۂ تعلیم اس لحاظ سے خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ انہوں نے ہائی اسکول میں صد فی صد حاضری رکھی۔ اس کے علاوہ ہاکی اور فٹ بال کے کپتان رہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کالج میں بھی معتمد انجمن اتحاد کلیہ جامعۂ عثمانیہ منتخب کئے گئے تھے اور کرکٹ کے کپتان بھی رہے۔ اسکے بعد ملازمت کا سلسلہ سٹی کالج ہی میں ہوا۔ دوران ملازمت میں فزیکل ایجوکیشنل کالج حیدرآباد میں تربیت حاصل کی اور اسوقت سٹی کالج کے فزیکل ورک کے انچارج ہیں۔ اسکے علاوہ اسپورٹس اور گیم کے سکریٹری بھی ہیں۔ غرض خانصاحب کی زندگی زندہ دلی، شگفتگی اور کھیل کود کے کمالات سے معمور ہے اور ان امور میں شاید ہی کوئی انکی ہمسری کر سکے

مولوی سید عبدالجبار صاحب بی اے ال ال بی سابق معتمد انجمن طلبائے قدیم سٹی کالج

مولوی عبدالجبار صاحب کی ابتدائی تعلیم مدرسہ مفید الانام میں ہوی۔ چنانچہ وہ وہاں کی بزم مباحثہ کے معتمد بھی تھے۔ ۱۹۱۵ء میں مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد مدرسہ مفید الانام چھوڑ کر سٹی ہائی اسکول میں شریک ہوئے اور یہاں تین سال تک زیر تعلیم رہکر ۱۹۱۸ء میں میٹرک کا امتحان امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا۔ مدرسہ میں جو تختۂ ممالک محروسہ میں اول آنے والے طلبہ کے ناموں کے اندراج کے لئے آویزاں رہتا تھا اسپر سید صاحب کا نام بھی درج ہوا۔ صدر مدرسہ مولوی فضل محمد خاں صاحب کی سید صاحب پر خاص نظر عنایت تھی۔

سٹی کالج میں بھی مولوی عبدالجبار صاحب بزم مباحثہ کے معتمد منتخب ہوئے اور جب ۱۹۱۸ء میں نظام کالج میں شریک ہوئے اور ۱۹۲۱ء تک تعلیم جاری رکھی تو اس وقت بھی اپنی علمی سرگرمیوں کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

نظام کالج کے بعد ۱۹۲۳ء میں کلیہ جامعہ عثمانیہ میں داخل ہوئے اور وہاں بھی اپنی مستعدی، علمی وادبی ذوق اور پرخلوص سرگرمیوں کے باعث انجمن اتحاد کے معتمد مقرر ہوئے۔ بی اے کے بعد ۱۹۲۶ء میں ال ال بی کا امتحان بھی نمایاں امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا۔ اسی قسم کے طالب علم ہر درسگاہ کیلئے باعث فخر ہوتے ہیں۔

ختم تعلیم کے بعد چند سال خاص دیانت اور خوش اسلوبی سے وکالت کا کام انجام دیا اور اب کچھ عرصہ سے

سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں منسلک ہیں۔

مولوی سید معین الدین قریشی صاحب ام اے سابق معتمد انجمن طلبائے قدیم سٹی کالج،

مولوی قریشی صاحب نے سٹی ہائی اسکول میں سکستھ فارم تک تعلیم پائی۔ ۱۹۱۹ء میں میٹرک کامیاب کر کے کلیہ جامعہ عثمانیہ میں شریک ہوئے اور وہاں اپنی سرگرمیوں اور ذوق ادب کی وجہ سے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ انجمن اتحاد کلیہ کے نائب صدر منتخب کئے گئے اور مجلہ عثمانیہ کے حصہ اردو کے مدیر بھی مقرر ہوئے ام اے کا امتحان ۱۳۳۷ف میں کامیاب کیا اور بعد تکمیل تعلیم تین سال تک مدرسہ آصفیہ فوقانیہ ملک پیٹھ کی صدارت بوجوہ احسن انجام دی انکا اسلوب تحریر نہایت شگفتہ اور پاکیزہ ہوتا ہے متفرق مضامین کے علاوہ انھوں نے ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب کی انگریزی کتاب "غالب" کا اردو میں نہایت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔

ڈاکٹر میر سیادت علی خاں صاحب ام اے ال ال بی مولوی فاضل بی سی ال ڈی فل (آکسفورڈ) پروفیسر قانون جامعہ عثمانیہ۔ رکن مجلس انتظامی انجمن طلبائے قدیم سٹی کالج

ڈاکٹر صاحب ۱۳۲۲ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۹ء تک سٹی ہائی اسکول میں زیر تعلیم رہے اور یہیں سے ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کا امتحان کامیاب کر کے اعلی تعلیم کیلئے کلیہ جامعہ عثمانیہ میں شریک ہوئے اور ام اے ال ال بی کے امتحانات کامیاب کرنے کے بعد بعطائے وظیفہ یورپ انگلستان روانہ ہوئے۔ اکسفورڈ میں بی سی ال اور ڈی فل کی اعلے ترین سندیں حاصل کیں اور لندن میں بیرسٹر بھی ہوئے۔

یورپ سے واپس ہو کر جامعہ عثمانیہ میں قانون کے پروفیسر مقرر کئے گئے اور اپنی غیر معمولی قابلیت اور طبعی انکسار کی وجہ سے اساتذہ و طلبہ میں خاص عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

مولوی عبدالقادر سروری صاحب ایم اے ال ال بی مددگار پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔ رکن مجلس انتظامی طلبائے قدیم سٹی کالج

مولوی سروری صاحب ۱۳۲۳ء ھ میں پیدا ہوئے۔ انکی ابتدائی تعلیم مدرسہ مفید الانام میں ہوئی اور فوقانی تعلیم کے لئے ۱۹۱۸ء میں سٹی ہائی اسکول میں شریک ہوئے ۱۹۲۰ء میں امتحان میٹرک کامیاب کرکے کلیہ جامعہ عثمانیہ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۶ء تک ایم اے اور ال ال بی کے امتحانات امتیاز کے ساتھ کامیاب کئے۔ ۱۹۲۷ء سے کالج میں مددگار پروفیسر اردو کی خدمت پر مامور ہوئے۔

اردو ادب کی تاریخ، تنقید اور افسانہ نگاری پر متفرق کتابیں لکھی ہیں جن میں حسب ذیل خاصکر قابل ذکر ہیں جو اپنے فن کی مستند کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔

(۱) دنیائے افسانہ (۲) کردار اور افسانہ (۳) دنیا کے شاہکار افسانے۔

(۴) تفصیلی فہرست اردو مخطوطات کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ (۵) جدید اردو شاعری۔

(۶) حیدرآباد کی تعلیمی ترقی گذشتہ ربع صدی کے اندر۔

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ ملک کے مشہور ادارے انجمن امداد باہمی "مکتبہ ابراہیمیہ" کے علمی رسالے "مکتبہ" کے کئی سال تک مدیر رہ چکے ہیں۔ اور اپنے سنجیدہ ذوق اور علم و فضل کی وجہ سے نوجوان انشاپردازوں میں وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

جناب رام لال صاحب بی اے ال ال بی مددگار معتمد مالگزاری رکن مجلس انتظامی طلبۂ قدیم سٹی کالج

جناب رام لال صاحب آبان ۱۳۱۶ف میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ مفید الانام اعتبار چوک میں حاصل کی۔ سٹی کالج میں جماعت فورتھ فام میں ۱۹۲۰ء میں شریک ہوئے۔ اور امتحان اسکول لیونگ سرٹیفکٹ میں ۱۹۲۳ء میں کامیابی حاصل کی۔ اسکے بعد نظام کالج کی انٹرمیڈیٹ کلاس میں شریک ہوئے

اور ۱۹۲۵ء میں کامیابی حاصل کی۔ بی اے بھی مدراس یونیورسٹی ہی سے ۱۹۲۷ء میں کامیاب کیا۔ پھر عثمانیہ یونیورسٹی میں ال ال بی کا امتحان درجۂ اول میں ۱۳۳۳ف میں کامیاب کیا۔ ال ال بی کے ابتدائی امتحان میں اول رہے۔ اسفندار ۱۳۳۵ف بہ حیثیت پروبیشنر تحصیلدار منتخب ہوئے۔ امتحان بندوبست میں جملہ شرکا میں اول آئے ۱۳۳۹ف میں امتحان عہدہ داران مال میں بھی فارغ ہوئے۔ امرداد ۱۳۴۰ف میں مستقل تحصیلدار ہوئے اور فروردی ۱۳۴۱ف سے مالگزاری میں بہ حیثیت مددگار معتمد متعین ہیں۔

مولوی مرزا محی الدین بیگ صاحب بی اے سی ٹی پرسنل مددگار ناظم زراعت سرکار عالی رکن مجلس انتظامی انجمن طلبۂ قدیم سٹی کالج

جناب مرزا صاحب ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم حیدرآباد ریزیڈنسی ہائی اسکول میں پائی۔ ۱۹۱۵ء سٹی ہائی اسکول میں شریک ہوئے اور ۱۹۱۸ء میں اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد نظام کالج میں داخل ہوئے۔ وہیں سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کیا اور پھر سٹی ہائی اسکول میں بحیثیت مدرس ملازم ہوئے۔ اسی اثنا میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے۔ سی ٹی کے امتحانات کامیاب کئے۔

سررشتہ تعلیمات سے سررشتہ طباعت وحفظان صحت سرکار عالی میں منتقل ہوئے۔ پھر وہاں سے سررشتۂ زراعت میں جہاں اس وقت پرسنل مددگاری نظامت کے عہدہ پر فائز ہیں

مرزا صاحب سٹی کالج کے زندہ دل قدیم طلبہ سے ہیں۔ ڈرامہ سے خاص دلچسپی ہے۔ چنانچہ کئی ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ بحیثیت ایکٹر بھی کام کیا ہے اور بحیثیت ڈائرکٹر بھی کام کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب تحریر نہایت شگفتہ اور دلچسپ ہوتا ہے۔ اکثر انجمنوں میں سرگرم حصہ لیتے ہیں اور انکی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی ہر جگہ انہیں مقبول خاص وعام رکھتی ہے۔

مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار سٹی کالج۔ رکن مجلس انتظامی انجمن طلبۂ قدیم سٹی کالج

مولوی سید محمد صاحب سٹی ہائی اسکول سے اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کا امتحان کامیاب کئے

کلیہ جامعہ عثمانیہ میں داخل ہوئے اور وہاں بی اے اور ام اے ۱۳۳۷ف کے امتحانات میں جامعہ میں اول آئے ان کے مضامین اختیاری اردو اور فارسی تھے اور ان مضامین کو لیکر سائنس کے طلبہ کے مقابلہ میں اول آنا آسان کام نہیں ہے۔

ختم تعلیم کے بعد اپنی قدیم درسگاہ سٹی کالج ہی میں معلم کی حیثیت سے شامل ہوگئے۔ اور اب میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں کو اردو اور فارسی کے درس دیتے ہیں۔ انکا ذوق ادب سٹی کالج کے طلبہ کی ادبی نشو ونما کی قابل قدر رہبری کر رہا ہے۔ انہوں نے اس وقت تک کئی مفید اور اعلےٰ کتابیں لکھیں اور مرتب کیں جن میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔

(۱) ارباب نثر اردو (۲) گلشن گفتار (۳) مثنویات میر (۴) ابتدائی قواعد اردو

(۵) ابتدائی قواعد فارسی

یہ سب کتابیں اردو کی اہم ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں۔

مولوی محمد عبدالرب صاحب آہکار دفتر دیوانی و مال وملکی وغیرہ رکن مجلس انتظامی انجمن طلبۂ قدیم سٹی کالج

مولوی عبدالرب صاحب ۱۳۱۷ف میں پیدا ہوئے ۱۳۳۱ف میں سٹی کالج میں شریک ہوئے۔ یہاں سے امتحان الیف اے کامیاب کرکے ناگپور اگریکلچر کالج میں داخل ہوئے اور تین سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد خانگی وجوہات کی بناء پر تعلیم ترک کرکے دفتر دیوانی و مال سرکار عالی میں ملازم ہوئے کھیلوں کا خاص ذوق رکھتے ہیں چنانچہ سٹی کالج میں کئی سال تک فٹ بال اور ہاکی وغیرہ کے کیپٹن رہے اور ہاکی اور فٹ بال اور کرکٹ کے فسٹ الیون میں شریک رہے۔

مولوی سید محمد اعظم صاحب ام اے۔ بی ایس سی صدر سٹی کالج

مولوی سید محمد اعظم صاحب۔ ڈاکٹر سید احمد صاحب مہتمم صدر مخزن ادویہ سرکار عالی کے فرزند اکبر ہیں۔ ۲ ر فروردی ۱۳۰۰ف کو بلدۂ حیدرآباد میں متولد ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں سٹی ہائی اسکول میں شریک ہوئے ازاں بعد چادرگھاٹ ہائی اسکول سے ۱۹۰۵ء میں مڈل کا امتحان درجہ اول میں کامیاب کیا اور جمیع امیدواران امتحان میں مضمون انگریزی میں اول رہے جس پر عماد الملک پرائز دیا گیا۔ مڈل اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ہی علی گڑھ بھیجے گئے جہاں سے انہوں نے ۱۹۰۷ء میں میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا اور امتیازی وظیفہ پایا۔ وہیں سے ۱۹۰۹ء میں ایف، اے کا امتحان پاس کیا اور بی۔ ایس سی کی تعلیم پانے لگے۔

بہ زمانہ تعلیم مولوی اعظم صاحب نہ صرف تعلیم میں بلکہ بازی گاہ میں بھی شہرت اور امتیاز سے مفتخر رہے۔ علی گڑھ کالج کی فٹبال ٹیم کے جنرل کپٹن تھے جو اپنے زمانے کی بہترین فٹ بال ٹیم تھی ۱۹۱۱ء میں وہ سینیر فوڈ مانیٹر یعنے صدر عریف طعام رہ چکے ہیں۔

۱۹۱۲ء میں اُن کو سرکار عالی نے یورپین وظیفہ تعلیمی دے کر انگلستان بھیجا اور وہ جامعۂ کیمبرج میں داخل ہوئے ۱۹۱۵ء میں سائنس میں ٹرائی پاس کامیاب ہوئے پھر ۱۹۱۶ء میں مضمون کیمیا میں تحقیقی کام کیا اور بی، ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد فن تعلیم کی عملی تعلیم اور تربیت کے لئے لندن بورڈ آف ایجوکیشن کے زیر نگرانی کام سیکھا۔ نیز انگلستان ہی میں ایک خاص مدرسہ میں تدریس کا کام بھی تین ماہ تک انجام دیا۔

۱۹۱۸ء میں انگلستان سے واپس ہو کر ضلع بیدر میں مہتمم تعلیمات کی خدمت پر مامور کیے گئے ایک سال کے بعد ۱۹۱۹ء میں مددگار ناظم تعلیمات مقرر کئے گئے اور پھر اسی سال سٹی کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے ابھی ابھی اُن کی صدارت کے پندرہ سال ختم ہوئے ہیں۔

مولوی اعظم صاحب مسٹر شاکر اس پرنسپل چادرگھاٹ کے بعد ہائی اسکول لیوئنگ سرٹیفکٹ بورڈ کے معتمد بھی رہے ہیں ۔ جامعہ عثمانیہ کے رفیق مجلس انتظامی کے رکن اور دیگر مجالس مثلاً شعبہ جات سائنس و فنون مجلس نصاب وغیرہ کے بھی رکن ہیں ۔

۱۹۲۸ء میں ان کو سرکار عالی کی طرف سے ورلڈ ایجوکیشن کانفرنس منعقدہ جینوا میں نمائندگی کے لئے روانہ کیا گیا تھا ٹراونکور اور کوچن کے تعلیمی انتظامات کے معاینے کے لیے بھی سرکار عالی کی طرف سے مقرر کئے گئے جس کے بارے میں ان کی مبسوط رپورٹ طبع ہو چکی ہے ۔

تقریباً (۱۵) سال سے مملکتی بنک امداد باہمی کے ڈایرکٹر اور تقریباً دس سال سے نائب صدر ہیں جس کی نیابت شملہ اور دہلی کی کانفرنسوں میں کی ۔

حال ہی میں ٹاون ہال باغ عامہ میں انجمن ہائے امداد باہمی حیدرآباد کی جو کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس کی صدارت کے لئے بھی آپ ہی کا انتخاب کیا گیا ۔ اور آپنے اس میں جو پرمغز اور بلند پایہ خطبہ پڑھا ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ اور خاص کر تحریک امداد باہمی سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب میں نہایت پسندیدگی اور وقعت کی نظروں سے دیکھا گیا ۔ مولوی سید محمد اعظم صاحب ملک کے نہایت ہی ممتاز ماہر تعلیم مانے جاتے ہیں اور سٹی کالج کے ان خاص طلبۂ قدیم میں سے ہیں جن پر خود درسگاہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے ۔

مولوی عبدالغفور صاحب مددگار مدرس سٹی کالج

عبدالغفور صاحب سٹی کالج کے قدیم ترین طلبہ میں سے ہیں چنانچہ پہلے پہل مولوی وجیہ الدین صاحب کے زمانہ صدارت میں دارالعلوم میں شریک ہوئے جب شافٹر صاحب کے تحت انگریزی جماعتوں کی شاخ قائم ہوئی تو انگریزی تعلیم شروع کی ۔ جب مدرسہ مسٹر راس کی صدارت میں پتھر گٹی پر منتقل ہوا تو مدرسہ کے ساتھ پتھر گٹی چلے آئے میٹرک جماعت تک تعلیم حاصل کی اور آخر کار اسی درسگاہ میں مشاہرہ

چالیس روپیہ منصرمانہ طور پر مامور رہوئے۔ پھر مسٹر گرانی صاحب کی سفارش پر ریاض گور کنٹونمنٹ میں بحیثیت ملٹری اور سول ٹیچر منتقل ہوے۔ جہاں بارہ سال تک کام کیا۔ من بعد کنٹونمنٹ کے برخواست ہونے پر، ۱۳۱۷ف میں سٹی کالج میں تقرر عمل میں آیا۔ اس وقت تک سٹی کالج میں کارگزار ہیں۔ مدت ملازمت ختم ہو چکی ہے مگر اب بھی قوی بہت اچھے ہیں۔ پابندی اوقات کام کرتے ہیں۔ تیسری توسیع دیگئی ہے تنخواہ پچھتر روپے ہے۔ مولوی صاحب نے دوران ملازمت میں کسی قسم کی رخصت سوائے رخصت اتفاقی جس کا سالانہ اوسط چار روز ہوتا ہے نہیں لی۔ اب بھی موٹر سیکل اور سیکل کی سواری کرتے ہیں مکان آصف نگر میں کالج سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ہے جہاں سے روزآنہ آتے ہیں۔

جناب رتن لال صاحب بی، اے۔ ڈپلایڈ مددگار مدرس سٹی کالج

رتن لال صاحب ۱۹۲۱ء میں سٹی ہائی اسکول میں جماعت فورتھ فارم میں داخل ہوئے تین سال کے بعد اسکول فائینل کے امتحان میں بدرجہ اول کامیابی حاصل کی پھر اسی کالج کی جماعت انٹرمیڈیٹ سال اول میں شریک ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں بدرجہ دوم کامیاب ہوئے اور جامعہ میں میرٹ کے لحاظ سے سوم رہے زمانہ طالب علمی کے ختم پر اسی درس گاہ میں بہ حیثیت مدرس کام کرنے کا موقع دیا گیا چنانچہ اب تک اسی خدمت پر کارگزار ہیں۔

اس خدمت کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنا تعلیمی سلسلہ بھی قائم رکھا۔ ۱۹۳۰ء میں خانگی طور پر جامعہ عثمانیہ کے بی، اے کے امتحان میں شریک رہے مضمون اختیاری ریاضی رہا ہے۔ اسی سال اس امتحان میں بدرجہ دوم کامیابی حاصل کی اور مضمون ریاضی میں اول آئے۔

اس کے بعد ۱۹۳۴ء میں بحصول رخصت تعلیمی جامعہ عثمانیہ کے امتحان ڈپلوما۔ ان ایجوکیشن میں شریک ہوئے اور اس کے نظری حصہ میں بدرجہ دوم اور عملی حصہ میں بدرجہ اول کامیابی حاصل کی۔ اپنی مستعدی اور محنت کی وجہ سے سٹی کالج کے اساتذہ اور طلبہ میں مقبول ہیں۔

جناب جی بیں بھان صاحب مددگار مدرس سٹی کالج

بھان صاحب کی ابتدائی تعلیم، مفید الانام ہائی اسکول میں ہوئی۔ اِس کے بعد سنٹرل ہندو کالجیٹ اسکول بنارس میں دو سال تک تعلیم حاصل کی۔ لیکن بیماری کی وجہ سے وہاں کی تعلیم منقطع کرنی پڑی پھر تین سال ورنگل ہائی اسکول میں تعلیم پائی۔

سٹی ہائی اسکول میں ففتھ فارم میں شریک ہوئے۔ فٹ بال اور ہاکی کپتان رہے۔ میٹرک کامیاب ہونے کے بعد علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں دو سال ایف، اے کی تعلیم پائی۔ وہاں یونیورسٹی ہاکی ٹیم اور انٹر میڈیٹ ہاکی ٹیم میں دو سال کھیلتے رہے۔

ایف، اے کی کامیابی کے بعد سٹی کالج میں ملازمت اختیار کی۔ بہرام الدولہ کرکٹ ٹورنمنٹ میں منجانب اساتذہ بلدہ کھیلنے کا موقع ملا۔

بھان صاحب نے اِسکاوٹ ماسٹر کی ٹریننگ بھی حاصل کی۔ اسکول ٹروپ کے ساتھ ساتھ ایک خانگی ٹروپ بھی جس کا نام سری کرشنا ٹروپ تھا اُن کے ماتحت کام کرتی رہی۔

سٹی ہائی اسکول سے اُن کو ٹیچرز ٹریننگ کالج میں بغرض تعلیم روانہ کیا گیا اور انہوں نے امتحان معلمی میں۔ علی میں بدرجہ اول کامیابی حاصل کی۔

ڈیڑھ سال سے سٹی کالج اسٹاف کلب کے جائینٹ سکرٹری ہیں اور اپنی مستعدی اور شگفتہ مزاجی کی وجہ سے بہت مقبول ہیں۔

مولوی محمد عبد الرحمن رئیس صاحب مدیر منشور و مقنن

مولوی عبد الرحمن صاحب سٹی کالج کے خاص کھلاڑی طلبہ سے ہیں اُن کو زیادہ تر ہاکی سے دلچسپی تھی وہ اس درسگاہ میں ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء میں شریک تھے۔ بعد کو کلیہ جامعہ عثمانیہ میں بی، اے

سینیئر تک تعلیم حاصل کی ۔

کالج کے زمانۂ تعلیم میں عبدالرحمن صاحب نے اپنی علمی اور سماجی سرگرمیوں اور مستعدی کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کر لی چنانچہ بزم معاشیات کے معتمد منتخب ہوئے تھے اور انجمن اتحاد کی کابینہ میں مجلس انتظامی کے رکن بھی تھے ۔

کالج سے باہر بھی حیدرآباد کی سماجی زندگی میں انہوں نے صدر خلافت کمیٹی حیدرآباد اور مسلم سوشیل لیگ ہر دو کے بانی اور معتمد کی حیثیت سے نمایاں حصہ لیا۔ تصنیف و تالیف کا بھی اچھا ذوق رکھتے ہیں چنانچہ متعدد مضامین کے علاوہ دو کتابیں سیرت و کردار اور قواعد اردو شائع کر چکے ہیں اور ایک کتاب لکھ رہے ہیں جس کا موضوع ہے "تاریخ تعلیم مملکت آصفیہ"

ان تصنیفات کے علاوہ دو رسالوں مقنن ہفتہ وار اور منشور روزآنہ کی ادارت بھی انجام دیتے ہیں ۔ صحافت سے بہت دلچسپی ہے چنانچہ حیدرآباد کی انجمن صحافت کے معتمد ہیں اور اس کی ترقی میں ہر طرح سے کوشاں رہتے ہیں ۔

سید محمد کرمانی مرحوم بی ، اے ۔ ائی ، سی ، یس ۔ ایچ ، سی ، یس

مرحوم سید محمد کرمانی صاحب کی ابتدائی تعلیم ضلع کریم نگر میں ہوئی ۔ ۱۹۲۲ء میں انہوں نے سٹی کالج میں فورتھ فارم میں شرکت فرمائی ۔ ۱۹۲۵ء میں سکول فائینل میں کامیاب ہوئے اور ممالک محروسہ سرکار عالی میں اول آنے کی وجہ سے گو کھلے اسکالرشپ حاصل کی ۔ اسی سال نظام کالج میں شریک ہوئے ۔ ۱۹۲۷ء میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان (مدراس یونیورسٹی) میں کامیابی حاصل کی ۔ اس سال جو دو طلبہ درجہ اول میں نظام کالج سے کامیاب ہوئے تھے اُن میں کرمانی مرحوم بھی ایک تھے ۔ باوجودیکہ ادبیات وغیرہ سے زیادہ دلچسپی تھی اور ریاضی میں کمزور تھے لیکن ضرورت زمانہ کو پیش نظر رکھ کر بی ، اے میں مرحوم نے ریاضی ہی کو اپنا خاص مضمون اختیار کیا اور بہت محنت کر کے اس میں

کافی فروغ و کمال حاصل کیا۔ ۱۹۲۹ء میں مدراس یونیورسٹی میں بی، اے میں کامیابی حاصل کی اور اسی سال حیدر آباد سیول سروس کے لئے مرحوم کا انتخاب عمل میں آیا اور مرحوم امتحان مقابلہ میں اول رہے ۱۹۳۰ء میں انہوں نے سیول سرویس کلاس کے آخری امتحان میں کامیابی حاصل کی اور جملہ کامیاب طلبہ میں دوسرے نمبر پر رہے۔

جنوری ۱۹۳۱ء میں بمنظوری سرکار عالی آئی سی یس کے امتحان مقابلہ میں شریک ہوئے جس کے نتیجہ کی بناء پر آئی سی یس کے لئے اُن کا انتخاب عمل میں آیا، چنانچہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۴ء تک ائی سی یس پروبیشنر کی حیثیت سے انگلینڈ میں رہے اور فائینل امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد براہِ فلسطین و مصر واپسی وطن کا قصد فرما رہے تھے کہ ایک حادثہ میں فلسطین میں قتل ہو گئے۔

مرحوم ایک اچھے مقرر تھے چنانچہ اپنے زمانہ میں نظام کالج یونین کے وائس پریزیڈنٹ بھی رہ چکے تھے۔

مولوی اشفاق احمد خان صاحب فرزند نواب فخر یار جنگ بہادر

اشفاق احمد خان صاحب سٹی کالج کے اُن طلبۂ قدیم سے ہیں جنھوں نے کھیلوں کی دنیا میں غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ وہ یکم اکٹوبر ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۲ء تک علی گڈھ میں زیر تعلیم رہے اور میٹرک کے لئے ۱۹۲۲ء میں سٹی کالج میں زیر تعلیم رہے۔

۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء میں علی گڈھ یونیورسٹی میں انٹرمیڈیٹ فرسٹ ایلون کے کپتان اور یونیورسٹی فٹ بال کلر حاصل کیا۔

فروری ۱۹۲۷ء میں انگلستان روانہ ہوئے اور ایڈنبرا یونیورسٹی میں شرکت کی وہاں اپنے اعلیٰ کھیلوں کی وجہ سے اسقدر جلد مقبول ہو گئے کہ اسی سال زمانہ کرسمس میں جیپال سنگھ آل انڈیا ہاکی ٹیم "

کے ساتھ ممالک فرانس بلجیم و اسپین کا دورہ کیا جو نہایت کامیاب سمجھا گیا کیونکہ ہندوستانی ٹیم اُن تمام کھیلوں میں فتحمند رہی جو دوران سفر میں کھیلے گئے جن کی تعداد چودہ تھی۔ ان چودہ کھیلوں میں تین بین الاقوامی تھے۔ جن میں سے اشفاق صاحب کی ٹیم نے دو کھیلوں میں اسپین کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کی اور ایک میں بلجیم کے مقابلہ میں۔

زمانۂ ایسٹر (EASTER) ۱۹۲۶ء میں "فوکسٹون ہاکی فسٹیول" میں "آل انڈیا ہاکی الیون" کے کپتان رہے۔ اِس موقع پر دنیا کی دیگر گیارہ اقوام نے بھی اپنی ٹیموں کو روانہ کیا تھا۔

۱۹۲۷ء میں اشفاق صاحب نے "ایڈنبرا اوپن ٹینس چیمپین شپ حاصل کی۔ اور "اسکاٹش پنگ پانگ ٹورنمنٹ" میں متواتر تین سال تک (یعنے ۱۹۲۷ء ۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۹ء میں) جیتتے رہے۔ اِس کے علاوہ "ایڈنبرا انڈین ہاکی کلب" کے ۱۹۲۸ء میں اور "ایڈنبرا انڈین کرکٹ کلب" کے ۱۹۲۹ء میں کپتان مقرر ہوئے۔ اسی اثنا میں متواتر تین سال (یعنے ۲۷ سے ۱۹۲۹ء تک) "ایڈنبرا یونیورسٹی ٹینس ٹیم" کی نمائندگی کی اور ۱۹۲۷ء میں "ہاف بلیو" اور ۱۹۲۸ء میں "فل بلیو" حاصل کیا۔ اسی طرح ۱۹۲۱ء میں سوانسی کالج ویلس کی ہاکی میں نمائندگی کی اور بلیو حاصل کیا۔

برطانیہ عظمیٰ کے انڈین کانفرنس کے لئے ۱۹۲۸ء میں اسسٹنٹ سکرٹری اور ۱۹۲۹ء میں سکرٹری منتخب ہوئے اور نہایت خوبی سے اپنے فرائض انجام دیئے

حیدرآباد واپس آنے کے بعد اشفاق صاحب نے محکمۂ پولس میں ملازمت اختیار کرلی اور اسوقت تک بحسن وخوبی یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔

جناب لکشمی نراین صاحب گپتا بی، ایس سی۔ ایچ، سی ایس مددگار صدر محاسب پبلک ورکس رایخ

گپتا صاحب ۳۰ جون ۱۹۰۸ء م امرداد ۱۳۱۷ف کو پیدا ہوئے۔ اِن کے والد راجچند صاحب راجہ بہادر موتی لال کے بھائی تھے۔ سٹی کالج میں ۱۹۱۸ء میں شریک ہوئے۔ یہیں سے ۱۹۲۳ء میں

مڈل اسکول کا امتحان اس اعزاز کے ساتھ کامیاب کیا کہ نہ صرف ممالکِ محروسہ میں اول آئے بلکہ جملہ سالہائے گزشتہ کے اول آنے والے امیدواروں میں سب سے زیادہ نشانات حاصل کئے ۔

۱۹۲۵ء میں بمبئی یونیورسٹی سے خانگی طور پر میٹرک کا امتحان دیا اور ریاضی میں امتیاز حاصل کرنے کے علاوہ کل یونیورسٹی میں چہارم آئے پھر بنارس ہندو یونیورسٹی میں شریک ہوئے اور ۱۹۲۷ء میں وہاں سے انٹرمیڈیٹ کامیاب کیا جس میں طبیعیات، کیمیا اور ریاضی میں امتیاز حاصل کیا، اور کل یونیورسٹی میں دوم آئے ۔

بی ۔ اس سی کی تعلیم کے لیے نظام کالج میں شرکت اور ۱۹۲۹ء میں مدراس یونیورسٹی سے سند حاصل کی ۔ گراجویٹ ہونے کے بعد اسی سال حیدرآباد سول سروس کے امتحانِ مقابلہ میں شریک ہوئے اور جملہ امیدواروں میں دوم آنے کی وجہ سے سول سروس میں منتخب ہوئے جس کا آخری امتحان ۱۹۳۰ء میں کامیاب کیا ۔ چنانچہ سب میں اول آئے تھے اس لئے "سرکیپن واکر طلائی تمغہ" حاصل کیا محکمۂ فینانس کے لئے نامزد کیے گئے اور عملی تجربہ حاصل کرنے کے لیے ناگپور کے محکمۂ صدر محاسبی کو روانہ کیے گئے ۔

وہاں انڈین اڈیٹ اور اکاونٹ سروس کا اعلیٰ امتحان محکمہ کامیاب کرنے کی وجہ سے سرکار عالی نے تین سو روپے کا بونس بھی عطا کیا ناگپور کے قیام کے زمانہ میں حکومتِ صوبہ متوسط کے اعزازی مددگار معتمد کی خدمت انجام دی ۔ ٹریننگ سے واپس ہونے کے بعد پہلے پہل دفتر صدر محاسب سرکار عالی میں کارگزار رہے اور اب پبلک ورکس آڈیٹ برانچ میں مددگاری صدر محاسب کی خدمت انجام دے رہے ہیں اس کے علاوہ گزشتہ سال سے انجنیرنگ کالج میں اکاونٹنسی پر درس بھی دیتے ہیں ۔

گپتا صاحب حیدرآباد کے نوجوان ہوطنیوں میں خاص وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں ۔ گزشتہ دو سال سے حیدرآباد سیول سروس اسوسی ایشن کے معتمد بھی ہیں ۔ ایسے ہی طبۂ قدیم



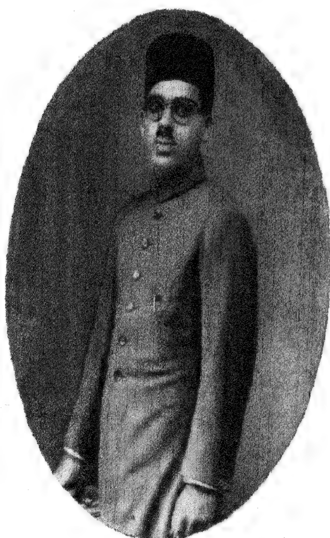
مولوی نادر اسمعیل مرزا صاحب



مولوی نعمت اللہ صاحب بی۔ کام بیرسٹر ایٹ لا
مددگار ناظم سررشتہ برقی



نواب بہاء الدین خان بہادر مددگار مہتمم کروڑگیری



ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب ال ایم اینڈ ایس
لکچرر تعلیم ورزش جسمانی

سٹی کالج کے لئے باعثِ فخر ہیں اور وہاں کے موجودہ طلبہ کے لئے لایق تقلید ۔

ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب ۔ ال ام اینڈ اس ۔ ڈی پی ای لکچرر فزیکل ایجوکیشن کالج

ڈاکٹر عبدالحی صاحب ۳ ر خورداد ۱۳۱۸ ف کو پیدا ہوئے ۔ سٹی ہائی اسکول میں ۱۳۲۶ ف میں سکنڈ اسٹانڈرڈ کی جماعت میں شریک ہوئے اور سال بہ سال کامیاب ہوکر آخر کار ۱۳۳۵ ف میں اسکول فائینل میں کامیاب ہوئے پھر عثمانیہ میڈیکل کالج میں شریک ہوکر ال ، ام اینڈ اس کا پانچ سالہ کورس ۱۳۴۱ ف میں ختم کیا اِس امتحان میں اپنے گروپ میں دوم رہے ۔

کامیابی کے بعد ایک ہفتہ کے اندر ہی محکمۂ طبابت میں بغیر درخواست کے سب اسٹینٹ سرجن کی خدمت پر تقرر ہُوا اور سنگاریڈی پر متعین کئے گئے لیکن اس خدمت سے چھ ماہ چار یوم کی ملازمت کے بعد ہی مستعفی ہونا پڑا ۔ کیونکہ اس اثنا میں فزیکل ایجوکیشن کالج کے افتتاح کے سلسلہ میں اُس کے صدر صاحب نے ڈاکٹر عبدالحی صاحب کو اپنے یہاں منتقل کرالینے کی کوشش کی تھی مگر محکمۂ طبابت نے اُن کو دینے سے انکار کر دیا تھا جس کی بنا پر ڈاکٹر صاحب کو مجبوراً مستعفی ہوکر فزیکل ایجوکیشن حیدرآباد کی خدمت کے لئے آنا پڑا ۔ یہاں وہ فزیالوجی اور ہائی جین کے لکچرر ہیں اور چار سال سے اِس کام کو نہایت خوش سلیقگی سے ادا کر رہے ہیں ۔ اس جدید ملازمت کے پہلے ہی سال اِس کالج کے ایک سالہ کورس ڈی ۔ پی ۔ ای کی بھی تکمیل کرلی ۔

گزشتہ ڈیڑھ سال سے خانگی پراکٹس بھی کر رہے ہیں اور اپنی ہمدردی اور مستعدی کی وجہ سے نیک نام ہیں ۔

مولوی محمد نعمت اللہ صاحب بی ۔ کوم ۔ بیرسٹرایٹ لا مددگار ناظم سررشتہ برقی حکومت سرکار عالی

مولوی نعمت اللہ صاحب مولوی حافظ لطف اللہ صاحب مرحوم کے فرزند اور مولوی محمد انوار اللہ صاحب

انجینیر مہتمم تعمیرات بلدہ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ وہ سٹی ہائی اسکول میں ابتداً فرسٹ کلاس میں شریک ہوئے اور وہیں سے ۱۹۰۹؁ء میں مڈل کامیاب کرکے میٹرک اور ایف۔ اے کی تعلیم شمالی ہند میں حاصل کی بعد میں بی۔ اے کے لئے دو سال نظام کالج میں شریک رہے ۱۹۱۹؁ء میں یوروپ تشریف لے گئے جہاں برمنگھام کی یونیورسٹی سے بی۔ کامرس کی ڈگری حاصل کی اور ساتھ ساتھ مڈل ٹمپل لندن میں بیرسٹری کی تکمیل کی انگلستان سے واپسی کے بعد ایک سال وکالت کرتے رہے۔ بعد ازاں گورنمنٹ کی ملازمت اختیار کی۔ اب منٹ ورکشاپ میں نہایت خوبی سے خدمت انجام دے رہی ہیں

مولوی مرزا حسین علیخاں صاحب ام اے۔ ال ال بی

مرزا حسین علی خاں خلف نواب مرزا شایخ علی خاں صاحب جاگیردار، قدیم معزز جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اِن کی آبا و اجداد دکن میں شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانہ میں آئے۔ جد اعلیٰ جاں نثار خاں شہنشاہ اورنگ زیب کے سربرآوردہ سپہ سالاروں میں تھے دکن کے مہمات میں اکثر اِس خاندان کے افراد نے کارہائے نمایاں کئے۔ جو مہتم بالشان اسناد اس خاندان میں چلے آتے ہیں اُن کے دیکھنے اور اُن شاہی فرامین کے پڑھنے سے، جو شاہان مغلیہ نے اِس خاندان کے افراد کے نام راست صادر فرمائے ہیں، ظاہر ہوتا ہے کہ دکن کے اکثر قلعہ جات پر اُن کی نگرانی اور سرداری رہی ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی قلعہ ملکھیڑ جو ایک قدیم قلعہ ہے معہ جاگیرات ان کے خاندان میں نسلاً بعد نسلاً جاگیر چلا آرہا ہے۔ اُن کا منتہائی نسب نادرشاہ سے ملتا ہے۔ ان کے نانا اسمعیل مرزا مرحوم آخر زمانۂ نواب ناصر الدولہ بہادر ایران سے حیدرآباد آئے اور منصب سے سرفراز ہوئے۔

یہ ۱۹۰۶؁ء میں بہ بقام عثمان آباد پیدا ہوئے۔ چار سال کے سن سے سات سال کے سن تک ایک خانگی استاد سے فارسی اور کلام مجید کی تعلیم پائی اور بعد ختم کلام مجید ۱۹۱۶؁ء میں مدرسۂ باب العلوم دارالشفاء میں شریک کئے گئے یہاں صرف چوتھی جماعت تک تعلیم ہوتی تھی۔ بعد کامیابی



مولوی سید عبد الرزاق صاحب



مولوی مرزا احمد اللہ بیگ صاحب



مولوی اشفاق احمد خاں صاحب



مولوی مرزا حسین علی خاں صاحب

Chandrakanth Press.

جماعت چہارم سٹی ہائی اسکول میں شریک کئے گئے جہاں فرسٹ، سکنڈ اور تھرڈ فارم تک تعلیم پانے کے بعد پونہ بھیج دئے گئے جہاں تقریباً دو سال تک تعلیم پائی اور سنٹ ونسنٹ ہائی اسکول میں شریک رہے۔

اس کے بعد بعض خانگی وجوہات کی بنا، پر ان کا سلسلۂ تعلیم ۱۹۲۱ء تک منقطع رہا۔ ۱۹۲۲ء میں شریک امتحان عثمانیہ میٹرک ہوکر بدرجہ دوم کامیابی حاصل کی اور انٹرمیڈیٹ بھی ۱۹۲۴ء میں بدرجۂ دوم کامیاب کرکے علی گڈھ چلے گئے۔ علی گڈھ میں ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ء تک زیر تعلیم رہ کر بی، اے۔ ام، اے اور ال ال، بی کے امتحانات بدرجۂ دوم کامیاب کئے اور اس کے بعد سلسلۂ تعلیم کو ختم کیا۔

نوٹ

سٹی کالج کا یہ سالنامہ اپنی اصل تاریخ اشاعت (یعنے ۱۲ دے ۱۳۴۴ف جو اس کے اندرونی سرورق پر مندرج ہے) کے قریب قریب چھ ماہ بعد شائع کیا جارہا ہے۔ قدیم طلبہ و اساتذہ کی تصاویر کی فراہمی اور پھر اُن کے بلاکس کی تیاری میں غیر متوقع طور پر تعویق ہوگئی۔ نیز متعدد قدیم طلبہ نے اپنے حالات بعد میں روانہ فرمائے جن کو بھی اسی پہلی اشاعت ہی میں شامل کرلینا مناسب سمجھا گیا چنانچہ اس مجموعہ میں صفحہ ۱۷۲ سے مدیر کا جو مضمون "سٹی کالج کے بعض قدیم طلبہ" کے عنوان سے شروع ہوتا ہے وہ ابتداءً صفحہ ۱۷۶ پر ختم ہوگیا تھا۔ اس لئے اس کے بعد صفحہ ۱۷۷ سے رپورٹ انجمن بابت ۱۳۴۳ف درج کردیگئی تھی مگر ان بعد کے اضافوں کی وجہ سے یہ مضمون بہت بڑھ گیا اور اب یہ (۲۰۳) صفحہ پر ختم ہو رہا ہے۔

اس طرح طلبۂ قدیم کے حالات سے متعلق اور ۲۸ صفحے زیادہ ہوگئے اور ان حضرات کی تعداد بھی دوگنی سے زیادہ ہوگئی۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اشاعت سالنامہ کی یہ تعویق اس کے حق میں ایک طرح سے مفید اور شاید مبارک ہی ثابت ہوی۔ ابتدا ہی سے ہماری یہ خواہش تھی کہ جتنے زیادہ برادران قدیم کے حالات دستیاب ہوں اتنا ہی ہمارا یہ سالنامہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا۔

سید محی الدین قادری

رپورٹ

انجمن طلبائے قدیم سٹی ہائی اسکول بابتہ ۱۳۴۳ف

از

مولوی سیّد محمد صفی صاحب بی اے معتمد انجمن

تمہید - تاریخ کے اوراق اتحاد و اتفاق کے کارناموں سے بھرے پڑے ہیں مشہور مقولہ ہے - دو دل یک شود بشکند کوہ را - یوں بھی اجتماعی سعی عمل ہمیشہ سے حصول مقصد کے لئے بہت زیادہ مفید رہی ہے۔ منظم کوششیں تو دور حاضر اور دنیائے جدید کا طرۂ امتیاز ہیں۔ کسی فرد واحد کی کوششوں کے مقابلہ میں ایک کثیر تعداد یا چند افراد کا باہم مل جلکر یک دلی و ہم آہنگی کے ساتھ کسی کام کو انجام دینا بہت زیادہ سودمند ثابت ہوتا ہے اور اسی کا نام انجمن ہے۔ ہر ملک میں ہر قوم میں کمیٹیاں ہیں۔ انجمنیں ہیں جو دفع زیان اور حصول منافع کے لئے مشترکہ و متحدہ محاذ پیش کرتی ہیں نہضت قومی اور ارتقاء منازل ترقی کے لئے جہاں اور بہت سے ذرایع ہیں وہاں اجتماعی سعی عمل سب سے بڑا حربہ ہے۔ جس قوم میں عمل و حرکت خلوص و ایثار اور سعی پیہم موجود نہ ہو تو وہ تہذیب و تمدن ترقی و ارتقاء حریت و آزادی کی دوڑ میں زندہ اقوام کا کیا ساتھ دے سکتی ہے اور حقیقت میں سعی پیہم ہی نام ہے زندگی کا۔ جہاں جس ملک میں اور جس قوم میں کچھ آثار حیات ہیں اسکے افراد میں اس قسم کی صلاحیت موجود رہتی ہے کہ وہ اجتماعی

سعی عمل کے ذریعہ اپنے ملک اور اپنی قوم کو ترقی کے اعلیٰ زینہ پر پہنچانے کی ہر وقت فکر میں لگے رہتے ہیں۔ غرض جہاں اس قسم کی انجمنی اور اداری کوششیں ہوتی ہیں وہاں تو ترقی کی کچھ امید کی جاسکتی ہے۔ اسی روح عمل اور جذبہ ترقی کے تحت انجمن طلباء قدیم سٹی ہائی اسکول کی تشکیل عمل میں آئی۔

سٹی ہائی اسکول - سٹی ہائی اسکول ایک بہت قدیم درسگاہ ہے۔ اسکی عمر (۶۰) سال سے زیادہ ہے اور یہ اپنی ابتدائے آفرینش سے ملک کی خدمت کر رہی ہے۔ سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں طلباء اس درسگاہ سے فیض یاب ہوئے اور چلے گئے یہاں کے بہت سے طلباء نے ملک کی بڑی بڑی خدمتیں انجام دیں شہرت کے آفتاب بن کر چمکے اور چمک رہے ہیں۔ ملک کے نونہالوں کی ذہنی دماغی اور جسمانی ترتیب میں اس ادارے نے جو حصہ لیا ہے اسکی برابری شاید ہی کوئی درسگاہ کرسکے۔ یہ حیدرآباد کا سب سے بڑا مدرسہ ہے۔ اسکی عظمت میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہورہی ہے ہمارے رعایا پرور علم دوست شاہ عالی جاہ کی بے مثل فیاضی نے اسکو دوسرے درجہ کا کالج بنا دیا ہے۔ جو اس وقت ایک شاندار سربلند عمارت میں رود موسیٰ کے کنارے کھڑا تمام ملک کو علم کا راگ سنا رہا ہے خدا کے فضل و کرم سے اسکو پرنسپل بھی ایسے ہی ملے جنہوں نے اسکی بہبودی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جن میں خصوصیت کے ساتھ گذشتہ پرنسپل راس صاحب اور خان فضل محمد خاں ایم اے حال ناظم تعلیمات اور موجودہ پرنسپل سید محمد اعظم صاحب کے اسماء گرامی اس درسگاہ کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ہمیشہ وابستہ رہیں گے۔ یہ درسگاہ ان پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔

تاریخ انجمن - آج سے بارہ سال پہلے ۱۳۲۲ء میں ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کی صدارت مولوی سید خورشید علی صاحب کی نائب صدارت اور مولوی عبدالقیوم خاں صاحب کی معتمدی کے ساتھ یہ انجمن منصہ شہود پر آئی۔ ابتدائی مراحل طے ہونیکے بعد ایک سال تک اس انجمن نے بڑے زور و شور کے ساتھ کام کیا۔ قواعد بنے ایٹ ہوم ہوئے۔ ڈرامہ ہوا۔ ڈنر ہوئے۔ جلسے ہوئے۔ غرض گوناگوں دلچسپیوں کے ساتھ سال ختم ہوا۔ اس سال مولوی عبدالقیوم خاں صاحب اپنے تعلیمی سلسلہ میں ولایت چلے گئے۔ بقیہ مدت کے لئے مولوی عبدالجبار صاحب نے خدمت معتمدی انجام دی۔ اسکے بعد نئے سال کے جدید انتخابات عمل میں آئے۔ اس نئی کابینہ نے تھوڑی بہت

دلچسپی دکھائی مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد قدیم طلباء کے تغافل اور کارکنوں کے تساہل نے اس پر ایک طویل جمود طاری کیا۔ مگر بحمداللہ وہ جمود عارضی ثابت ہوا۔ اور ایک عرصہ کے خواب گراں کے بعد چند ارکان انجمن بشمول سابق معتمد کی مسلسل کوششوں سے اس نے پھر ایک کروٹ لی۔ صد شکر اس میں پھر کچھ آثار حیات دکھائی دے رہے ہیں امید ہے کہ طلباء قدیم کی گذشتہ سہل انگاری آئندہ کے لئے تازیانہ کا کام دیگی۔ اور آنے والے جدید عہدہ دار اور تمام قدیم طلباء اسکے کاروبار کو ہر طرح سے کامیاب بنائیں گے۔

۱۳۴۲ف ۔ اس سال کی کارروائیوں کا آغاز مولوی مرزا محمد علی بیگ صاحب نائب ناظم جنگلات کی صدارت میں جلسہ عام سے ہوا۔ سابق معتمد نے رپورٹ سنائی۔ یہ تحریکات پیش کیں کہ قواعد پر نظر ثانی کی جائے اور چندہ گھٹا کر چار روپئے کے بجائے دو روپیہ کر دیا جائے جو بالاتفاق منظور ہوگئیں۔

فہرست انتخابات ۔ جدید انتخابات عمل میں آئے جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

صدر ۔ مولوی سید خورشید علی صاحب ناظم دفتر دیوانی و مال و ملکی و استیفاء مناصب خطابات و مواجب

نائب صدر ۔ مولوی عبدالقیوم خاں صاحب انجینیر عمارات جامعہ عثمانیہ

معتمد ۔ سید محمد صفی

نائب معتمد ۔ جی۔ بی۔ بھان صاحب

معتمد تفریحات ۔ مولوی سید احمد خاں صاحب۔

خازن ۔ مولوی کریم اللہ خاں صاحب۔

اراکین

مولوی غلام قادر صاحب۔ مولوی معین الدین صاحب انصاری۔ مولوی معین الدین صاحب قریشی۔ راجہ رام لعل صاحب۔ مولوی احمد محی الدین صاحب اڈیٹر رہبر دکن۔ ڈاکٹر سیادت علی صاحب۔ راجہ ترنگ لعل صاحب جاگیردار۔ مولوی عبدالقادر صاحب سروری۔ مولوی عبدالوہاب صاحب۔ مولوی احمد علی خاں صاحب۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور۔ مولوی عبدالجبار صاحب۔

انتخابات کے بعد صدر جلسہ نے ایک پرجوش تقریر کی۔ اس کے بعد تمام حاضرین کی بہت ہی پرلطف ایٹ ہوم سے تواضع کی گئی۔ جلسہ توقع سے زیادہ کامیاب رہا۔

سال زیر رپورٹ میں کابینہ نے جو حقیقتاً اپنی مدت مقررہ کے چار ماہ بعد تشکیل پائی چودہ انتظامی جلسے کئے۔ اثنائے سال میں مولوی معین الدین صاحب انصاری۔ مولوی احمد علی خاں صاحب اور مولوی احمد محی الدین صاحب ایڈیٹر رہبر دکن اپنی خانگی اور سرکاری مصروفیات کی وجہ سے رکنیت سے مستعفی ہوگئے۔ جن کی جگہ پر مجلس انتظامی نے مولوی مرزا محی الدین بیگ صاحب۔ مولوی عبدالروف صاحب اور مولوی سید محمد صاحب کا انتخاب کیا۔

جلسۂ عام کے بعد مجلس انتظامی نے پہلا جلسہ ۱۲ر فروردی ۱۳۴۲ف کو بمقام گریٹ ہال سٹی کالج منعقد کیا۔ اور جوش و خروش کے ساتھ کام شروع کیا۔ اس جلسہ میں یہ تحریک بھی منظور ہوی کہ پچاس روپیہ کے ۲ دو انعام سٹی ہائی اسکول کے اُن دو طلباء کو دیئے جائیں جنھوں نے سرکاری امتحانات اسکول لیونگ اور عثمانیہ میٹرک میں مدرسہ کی حد تک سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے ہوں۔ رقم انعام سٹی کالج کے پرنسپل صاحب کو بھیجدی گئی اور اسکی تقسیم انہی کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی کہ وہ روپیہ یا کسی اور صورت میں تقسیم کریں۔

انجمن کی سلک گذشتہ یعنے (سالِ گذشتہ) کو (ساصہ) کی تکمیل کر کے سنٹرل بنک میں ایک سال کیلئے بمد امانت جمع کر دیا گیا۔

ترمیم و اصلاح قواعد انجمن جلسہ عام کی منظورہ تحریک قواعد کی نظر ثانی کا کام سب سے پہلے شروع کیا گیا۔ اس وجہ سے کہ یہ کام جیسا کچھ سخت مشکل اور صبر آزما ہے وہ ظاہر ہے اسکے علاوہ بعض دفعات میں سختی کی وجہ سے گذشتہ جو موانعات پیش آئے انکی بھی اصلاح مدنظر تھی۔ پہلے تو اس کام کو ایک مجلس منتخبہ کے سپرد کیا گیا جو مولوی غلام قادر صاحب مولوی عبدالجبار صاحب۔ مولوی سعید احمد خاں صاحب۔ مولوی کریم اللہ خاں صاحب اور معتمد پر مشتمل تھی۔ جنھوں نے بڑے غور و خوض سے پورے قواعد پر نظر ثانی اور اسکی ترمیم و اصلاح کر کے مجلس انتظامی میں پیش کیا۔ مجلس انتظامی نے اس خشک کام کو بڑی کد و کاوش کے بعد تقریباً (۵) جلسوں میں ختم کیا۔ ہر ہر فقرہ پر بحث ہوی ایک ایک لفظ پر غور کیا گیا۔ بعد ازاں مرمہ

قواعد کو مولوی عبدالقادر صاحب سروری کے تفویض کیا گیا کہ وہ اسکی ترتیب وغیرہ کو درست کریں۔ صاحب موصوف نے بڑی محنت سے اس کام کو انجام دیا۔ جس کے لئے انجمن مشکور ہے۔ اور اب وہ مرتبہ قواعد جلسہ عام میں منظوری کے لئے پیش کئے جائیں گے۔

منجملہ تمام اصلاحات قواعد چند درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

(۱) انجمن کے نام کی تبدیلی۔ یعنے سٹی ہائی اسکول کے بجائے سٹی کالج۔

(۲) مدت انتخاب عہدہ داران وارکین مجلس انتظامی کی صراحت ایک سال از ابتداء آذر تا ختم آبان۔

(۳) جلسہ عام میں کسی آڈیٹر کا انتخاب برائے تنقیح حسابات انجمن۔

قواعد کی اصلاح و ترتیب کے بعد انجمن نے اشاعت سالنامہ کا کام شروع کیا۔ موجودہ حالات اور عام کسادبازاری کے زمانہ میں کسی سالنامہ کا نکالنا کچھ کم اہم کام نہیں۔ سالنامہ کی خوبیوں میں اضافہ کرنے کیلئے اسکو مصور بھی بنادیا گیا ہے۔ یہ سالنامہ بالکلیہ سٹی ہائی اسکول کے طلبا، کی حد تک محدود ہے۔ اسکے تمام مضمون نگار اس درسگاہ کے قدیم طلباء ہیں مضمون نگاری کو اس طرح محدود کردینا کسی رسالے کے علمی معیار کو کم کردینا ہے مگر باوجود اس تحدید کے سالنامہ کی صوری و معنوی خوبیوں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ طلبائے قدیم کی علمی اور ادبی مشاغل کا معیار کس قدر بلند ہے۔ خدا سے امید ہے کہ یہ سالنامہ سالنامہ نہ رہے بلکہ ماہ نامہ بنے اور ماہ نامہ سے روزانہ ہوجائے۔ سالنامہ کی طباعت کے اخراجات کا سوال پیش ہوا تو عہدہ داران وارکین مجلس انتظامی نے سالنامہ کی پیشگی خریداری سے تھوڑی بہت رقم فراہم کردی جو بڑی سہولت کا باعث ہوئی ورنہ مجتمعہ رقم میں سے صرف کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی مگر ایسی نوبت نہ آئی۔ اراکین کا تو یہ خیال تھا کہ سالنامہ نکالیں ایٹ ہوم اڑائیں، جلسے کریں، سب کچھ ہو مگر رقم مجتمعہ (سرکاری ڈھیری) کو ہاتھ نہ لگائیں، بحمداللہ ہم اس میں کامیاب رہے۔ رقم لینا تو ایک طرف ہمیں اور اضافہ ہی کیا سالنامہ کی تیاری میں مولوی ڈاکٹر سید غلام محی الدین قادری صاحب زور ریڈر وفینراد رہمارے محترم صدر انجمن نے

بڑی محنت اٹھائی جس کے لئے مجلس انکی بیحد ممنون ہے۔

ڈنر بقرعید کے موقع پر ایک ڈنر کی ترتیب کا مسئلہ مجلس انتظامی نے منظور کر لیا تھا۔ مگر اس وقت نواب صلابت جاہ بہادر کے انتقال پر ملال کی وجہ سے اس کو ملتوی کر دیا گیا اور یہ تصفیہ کیا گیا کہ ڈنر اور سالنامہ کی اشاعت ایک ہی روز ہوں۔ بعد میں ڈنر کو جلسۂ سالانہ کے ساتھ ملا دیا گیا۔ جس میں آج آپ شریک ہو گئے

کسی کام کے کرنے کے لئے سب سے پہلے روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے اور حقیقت میں اس اقتصادی پستی کے زمانہ میں روپیہ کی فراہمی بڑا ہی مشکل کام ہے اس کو تو وہی لوگ خوب جانتے ہیں جنہوں نے اس منزل میں قدم رکھا ہے۔ سٹی ہائی اسکول کے طلبہ کی تعداد سینکڑوں نہیں ہزاروں تک پہنچتی ہے اور تقریباً ہر جگہ آپ کو سٹی ہائی اسکول کے طلباء ملیں گے۔ بڑے سے بڑے عہدوں پر بھی اسکے طلباء کی رسائی ہے مگر باوجود اس کے معلوم نہیں کیوں ان حضرات نے انجمن میں شریک ہونے کی طرف توجہ نہیں کی۔

چندہ بجائے للعہ روپیہ کے (عہ) روپیہ سالانہ کر دیا گیا ہو تو ایسی صورت میں تو کسی شخص کو تامل نہ ہونا چاہئے تھا۔ شاید گذشتہ دس سالہ سکوت نے لوگوں کو اسکی طرف سے بدظن کر دیا ہو۔ مگر اب جبکہ انجمن نے اپنی زندگی کا ثبوت دیدیا۔ حقیقت حال کا اظہار کر دیا تو میرے خیال میں آئندہ ایسا نہ ہوگا اور طلباء قدیم کی ایک نظر خوش گذرے۔ اس انجمن کو کامیاب بامراد بنا سکتی ہے ہماری ان حضرات سے مخلصانہ گزارش ہے کہ وہ اس طرف توجہ کریں اور دامے درمے سخنے (میں یہاں ایک لفظ اور زیادہ کرتا ہوں۔ دامے درمے سخنے اور قلمے سے دریغ نہ کرینگے۔ لفظ قلمے میں نے یہاں زیادہ تو کیا مگر درمے پر زیادہ زور دیتا ہوں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ ہماری اپیل رائیگاں نہ ہو جائے گی۔ اور آنے والی کابینہ کو اس وقت کا سامنا کرنا نہ پڑے گا۔ جس سے ہم دوچار رہے۔ تمام قدیم طلباء خود بخود رجوع ہوں گے۔ اور اپنی زندگی کا ثبوت دینگے۔ اور اس انجمن کو اپنا اپنی قوم اور اپنے ملک کی فلاح وبہبود کا ذریعہ بنا کر اس کو آگے بڑھائیں گے۔ آخر میں ہم آنے والے جدید عہدہ داروں کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں اور کہ وہ ہماری توقعات سے زیادہ اس انجمن کو کامیاب بنائیں گے۔

حق ناشناسی ہوگی اگر میں اس خوشگوار فریضہ سے اعراض کروں۔ یعنے ان حضرات کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے اس انجمن کو خواب گراں سے بیدار کیا۔ اسکے تن بے جان میں روح پھونکی۔ ایک نئی امنگ اور جوش کے ساتھ کام کیا۔ اپنا بہت سا عزیز اور قیمتی وقت اس کے لئے صرف کیا۔ سب سے پہلے مولوی سید خورشید علی صاحب کا نام لیتا ہوں۔ صاحب ممدوح باوجود گوناگوں شدید مصروفیتوں کے نہ صرف بلاناغہ ہر جلسہ میں تشریف لائے بلکہ آپ ہی نے اپنی خوش اخلاقی سے ترتیب و اصلاح قواعد اور دیگر خشک کاموں کو دلچسپ بنایا۔ اور کئی دفعہ اپنی عادتی فیاضی سے ارکان کو ضیافتوں سے بھی لطف اندوز فرمایا۔ آپ کے متعلق یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ آپ ہی انجمن کے روح رواں تھے۔ دیگر ارکان عہدہ داران انجمن میں سے خصوصیت سے مولوی غلام قادر صاحب ڈاکٹر زور صاحب مولوی سروری صاحب۔ مولوی سعید احمد خاں صاحب۔ مولوی مرزا محی الدین بیگ صاحب مولوی عبد الرب صاحب راجہ رام لعل صاحب قابل ذکر ہیں۔ ان اصحاب نے بھی اپنا عزیز اور قیمتی وقت صرف کرکے انجمن کو کامیاب بنانے میں کافی حصہ لیا۔ ہم ان تمام اصحاب کے ممنون و مشکور ہیں۔ یہاں یہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انجمن نے اپنے ابتدائی سال میں جو رقم فراہم کی تھی وہ اب تک جوں کی توں محفوظ ہے۔ انجمن کے دیرینہ سکوت و جمود نے انجمن کی طرف سے عام طور پر اس رقم کے متعلق بدگمانی پیدا کر دی تھی۔ مولوی کریم اللہ خاں صاحب مستحق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اس رقم کی جیسے چاہئے تھی ویسی ہی حفاظت کی۔ اور اتنی بڑی رقم کا بوجھ ایک بڑے حصہ تک اپنے کندھوں پر اٹھائے رہے۔ ہم خاں صاحب کے اسلئے بھی ممنون ہیں کہ انہوں نے اس سال کے حسابات پاک و صاف رکھے اور داد و ستد میں بڑی مدد دی۔ انجمن مولوی احمد محی الدین صاحب اڈیٹر رہبر دکن اور عبد الرحمن صاحب اڈیٹر منشور کو بھی فراموش نہیں کرسکتی کہ ان حضرات نے وقتاً فوقتاً اعلانات کی اشاعت سے انجمن کی امداد فرمائی جس کے لئے انجمن ممنون ہے۔ مولوی سید محمد اعظم صاحب کا نام نامی بھی اس انجمن کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس انجمن کے قیام میں آپ نے گراں قدر امداد فرمائی تھی اور سال گذشتہ جلسۂ عام میں تشریف لاکر انتخاب وغیرہ میں

حصہ لیا تھا۔ اس کے علاوہ آپ نے سٹی کالج میں جلسوں کے انعقاد وغیرہ کی اجازت دیکر بڑی سہولت عطا کی جس کے لئے انجمن ممدوح کی ممنون ہے

مجلس انتظامی میں یہ تحریک بھی پیش کی گئی تھی کہ سٹی ہائی اسکول کے تعلیم یافتہ طلباء کی ایک مبسوط فہرست بنائی جائے۔ انکے حالات سے انجمن واقف ہو اور ضرورت اور ممکن ہو تو ان کی امداد کیجائے۔

اس کے لئے اخبار میں متعدد مرتبہ اعلان بھی کیا گیا کہ جن قدیم طلباء کو جو نام معلوم ہوں اور جن کے پتہ پیشہ وغیرہ سے واقف ہوں انجمن کو مطلع فرمائیں مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کسی بندۂ خدا نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ آنے والی جدید کابینہ ضرور اس جانب توجہ کریگی۔

بالفعل انجمن کا کوئی مرکز اور مستقر نہیں ہے اس کی بھی کوشش کی گئی کہ آرائش بلدہ سے چمن فضل گنج پر ایک پلاٹ حاصل کیا جائے اور بعد میں اس پر ایک مکان تعمیر کرکے اسکو انجمن کا مستقر بنایا جائے۔ اس مکان کو ایک کلب کی شکل دیجائے۔ مگر حالات کی ناموافقت کی وجہ سے یہ تحریک بھی جامۂ عمل نہ پہن سکی۔ میں تمام ارکان سے اسکے متعلق پر زور اپیل کرتا ہوں کہ وہ ضرور بضرور اس جانب توجہ فرمائیں گے۔

تختہ جمع و خرچ انجمن طلبائے قدیم سٹی کالج - من ابتدائے ۱۶ اسفندار سنہ ۱۳۴۳ف لغایتہ ۹ دے سنہ ۱۳۴۴ف

جمع		خرچ	
سلک گزشتہ	سماللوبے ۱۲/۱۳۴ہ	اخراجات اٹ ہوم	ماامومہ
چندہ اٹ ہوم	ماسہ	انعامات طلباء	۸/ صہ
چندہ رکنیت	مایہ	فوٹو مجلس انتظامی	یہ
پیشگی وصول بابتہ ڈنر	مالعہ	صادر	۱۲/ صلعہ
" قیمت سالنامہ	ماصلعہ	خرچ طباعت سالنامہ	ماسکہ
		کھاتہ اماتنی	سہمہ
		متفرق	ابعہ
		سلک موجودہ	ماعہ ۷/۱۳۴ہ
میزان	الماللوامعہ ۱۲/۱۳۴ہ	میزان	الماللوامعہ ۱۲/۱۳۴ہ

قواعد

انجمن طلبائے قدیم سٹی کالج

مرتبہ و مرممہ مجلس انتظامی

منظورہ

جلسۂ عام انجمن منعقدہ ۱۷ خورداد سنہ ۱۳۴۴ف

فہرست ابواب

باب (۱)
اغراض و مقاصد

ابتدائی۔ یہ انجمن "انجمن طلبائے قدیم سٹی کالج" کے نام سے موسوم ہوگی

دفعہ (۱)۔ اس انجمن کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں:۔

(۱) سٹی کالج کے قدیم طلباء کے آپس میں میل جول اور اتحاد پیدا کرنا اور کالج اور اس کے کاروبار سے اُن کے تعلقات کو قائم رکھنا نیز اُن تعلقات کو کامیاب بنانے کے ذرائع پیدا کرنا۔

(۲) طلبائے قدیم اور حال کے درمیان میل جول اور اتفاق کو بڑھانا۔

(۳) اراکین انجمن میں ایک خاص قسم کی ہم آہنگی پیدا کرنا۔

(۴) ایسے قدیم طلباء اور اُن کے خاندان کی جو مفلوک الحال ہوں حتی الامکان مدد کرنا۔

(۵) جو قدیم طلبا تعلیم جاری رکھنا چاہتے ہوں اور قابل امداد ہوں ان کو جہاں تک ممکن ہو امداد دینا۔

دفعہ ۲ ۱۔ ایک ایسی سالانہ رپورٹ شائع کرنا جس میں انجمن کی سال بھر کی کارگذاری اور طلبائے قدیم سے متعلق مفید اور قابل ذکر واقعات درج ہوں۔

۲۔ اگر ممکن ہو تو کسی سال ایک ایسا رسالہ یا پرچہ یا سال نامہ شائع کرنا جو حسب ذیل خصوصیات پر مشتمل ہو۔

(ا) طلبائے قدیم کے حالات، ان کی تصویریں اور عملی دنیا میں اُن کی کارگزاریاں۔

(ب) ایسے مخصوص مضامین یا نظمیں جن کے مطالعے سے طلبائے قدیم اور حال کی قلبی اور دماغی کیفیتوں اور قابلیتوں کا اظہار ہو سکے اور آنے والے طالب علموں کو معلوم ہو سکے کہ اُن کے پیشرو اس درسگاہ سے کیسی تربیت پا کر نکلے اور انہوں نے اپنے اپنے عرصہ ہائے عمل میں کیا کیا نمایاں کام انجام دیا۔

(ج) اس مجموعے میں ایسے مقالے بھی شریک ہوسکیں گے جو حیدرآباد کی معاشرتی اقتصادی اور علمی ضرورتوں اور اصلاحی تجویزوں پرمشتمل ہوں۔

(د) اس درسگاہ اور اس کے طلباء کی سال بھر کی مشغولیتیں اور واقعات بھی قدیم طلباء کی آگاہی اور دلچسپی کے لئے اِس مجموعے میں شامل کئے جاسکتے ہیں۔

توضیح اس مجموعے کی ترتیب اور اشاعت کے وقت اس امر کا لحاظ رکھا جائے گا کہ یہ سالنامہ سٹی کالج کی دیرینہ روایات کے شایان شان ہو' اور اس کے ذریعہ طلبائے قدیم اور حال کے حالات اور خیالات میں حتی الامکان ہم آہنگی پیدا ہوسکے اور معلوم ہوسکے کہ اس درسگاہ کے فیضیاب' خواہ وہ کسی طبقے یا پیشے سے متعلق کیوں نہ ہوں اور خواہ وہ آج تعلیم پارہے ہوں یا آج سے ساٹھ سال قبل تعلیم پاچکے ہوں' ایک مخصوص شائستگی (کلچر) اور تربیت کے حامل ہیں۔

۳۔ سال میں کم ازکم ایک مرتبہ طلبائے قدیم کا جلسہ ہوا کرے گا۔

۴۔ طلبائے قدیم کی امداد کے لئے ایک امدادی فنڈ جمع کیا جائے گا جس میں قدیم طلبا اپنی آمدنی کا کچھ فی صد ماہانہ یا سالانہ دیا کریں گے اِس کے علاوہ عام طور سے بھی اس فنڈ کو بڑھایا جاسکے گا۔

۵۔ سالانہ ڈنر یا ایٹ ہوم ترتیب دئے جائیں گے۔ ایسے ڈنر اور ایٹ ہوم نہ صرف دارالسلطنت بلکہ اضلاع کے ایسے مقام پر بھی ہوسکیں گے جہاں طلبائے قدیم کی کافی تعداد جمع ہوسکے۔

۶۔ مذکورہ بالا وسائل کے علاوہ وقتاً فوقتاً ایسے ذرائع سے بھی کام لیا جاسکے گا جو عام طور پر کالج یا انجمن کے لئے مفید متصور ہوں۔

باب ۲

رکنیت انجمن

دفعہ ۲:- سٹی کالج کے ایسے تمام قدیم طلبا، اس انجمن کے رکن ہو سکتے ہیں جنہوں نے کم از کم چھ ماہ اس ادارے کی کسی جماعت میں تعلیم پائی ہو۔

دفعہ ۳:- اگر کسی طالب علم کا نام بد اخلاقی کی وجہ سے اسکول سے خارج کر دیا گیا ہو اور اس کی اطلاع پرنسپل مدرسہ نے معتمد انجمن کو باضابطہ دیدی ہو تو جب تک اس کی تردید نہ ہو یا انجمن کے کسی عام جلسہ میں ⅔ اراکین جو اس وقت موجود ہوں۔ اس کی رکنیت کے موافق رائے نہ دیں وہ ہرگز رکن نہ ہو سکے گا۔

دفعہ ۴:- وہ اشخاص جو قدیم طالب علم نہوں، مگر انجمن کے ساتھ خاص ہمدردی رکھتے ہوں اور اس کے کاموں میں عملی حصہ لیتے ہوں مجلس انتظامی کی متفقہ رائے ہونے پر اس انجمن کے رکن ہو سکیں گے

دفعہ ۵:- جو اراکین یکمشت (۵۰) روپیہ ادا کریں وہ انجمن کے دوامی رکن متصور ہوں گے اُن سے سالانہ چندہ نہیں لیا جائے گا۔

باب ۳

انجمن کے عہدداران کے اختیارات اور فرائض

دفعہ ۶:- انجمن کے کارکن حسب ذیل عہدہ دار ہوں گے:-

(۱) صدر، (۲) نائب صدر، (۳) معتمد، (۴) نائب معتمد، (۵) معتمد شعبہ ورزش و تفریحات، (۶) خزانہ دار، (۷) بارہ اراکین ان سب کا انتخاب انجمن کے سالانہ عام جلسہ میں ہوا کرے گا اور یہ انتخاب ایک سال کے لئے ہوگا۔

دفعہ :۔ عہدہ داروں کے اختیارات اور فرائض حسب ذیل ہوں گے۔

(أ) صدر۔

(۱) مجلس انتظامی وغیرہ کے تمام جلسوں کی صدارت کرے گا۔

(۲) مجلس انتظامی و مجلس عام کے جلسے یا غیر معمولی جلسے منعقد کرنے کا مجاز ہوگا۔

(ب) نائب صدر۔ صدر کی عدم موجودگی میں صدر کے فرائض انجام دے گا۔

(ج) معتمد

(۱) تمام دفتری معاملات کا ذمہ دار ہوگا اور انجمن کی تمام مراسلت اسی کے ذریعہ ہوگی۔

(۲) ہر قسم کے جلسوں کی روئداد مرتب کرے گا۔

(۳) مجلس انتظامی کی اجازت سے انجمن کے سالانہ ایٹ ہوم، ڈنر، لکچر یا ملاقاتی جلسے وغیرہ ترتیب دیا کرے گا۔

(۴) عہدہ داروں کے انتخابات کے متعلق جو جلسے ہوں گے اُن کے اور دوسرے تمام جلسوں کے اعلان کیا کرے گا۔

(۵) سالانہ رپورٹ مرتب کرکے مجلس انتظامی کی منظوری کے بعد مجلس عام میں پیش کرے گا۔

(۶) مجلس انتظامی کو ان حضرات کے ناموں سے وقتاً فوقتاً واقف کرتا رہے گا جو اس کے جلسوں سے غیر حاضر رہتے ہیں۔

(د) نائب معتمد۔ معتمد کی عدم موجودگی میں معتمد کے فرائض انجام دے گا۔

(ھ) معتمد شعبۂ ورزش و تفریحات۔

(۱) انجمن کے شعبہ ورزش و تفریحات کا ذمہ دار ہوگا۔

(۲) تمام کھیلوں، مقابلوں اور سالانہ اسپورٹس کی تاریخیں مقرر کیا کرے گا۔

(۳) مختلف کھیلوں کے کپتانوں کے انتخاب کی غرض سے انجمن کی شاخ ورزش کے سالانہ اجلاس منعقد کیا کرے گا۔

(۴) شاخ ورزش کے اراکین کا مکمل رجسٹر مرتب رکھے گا۔

(۵) اس شعبہ سے متعلق تمام اشیاء اس کی حفاظت میں رہیں گی۔

(۶) شاخ ورزش کی سالانہ کارگذاری کے متعلق ایک رپورٹ مرتب کرکے اپنی رائے کے ساتھ اسے مجلس انتظامی میں پیش کرے گا تاکہ بعد منظوری انجمن کی سالانہ رپورٹ میں شامل کی جاسکے۔

(و) خزانہ دار

(۱) انجمن کی تمام رقوم دوسری تمام متعلقہ چیزیں خزانہ دار کے زیر حفاظت رہیں گی۔

(۲) انجمن کے اراکین کی ایک مکمل فہرست اور آمد و خرچ کا ایک رجسٹر رکھیگا جس میں سالانہ تقاریب کا بھی ذکر کیا جائے گا۔

(۳) انجمن کے اخراجات کے وثیقے بھی اس کے پاس رہیں گے۔

(۴) اگر کسی رکن کے ذمہ کچھ بقایا ہو تو اُس کی یادداشت اس رکن کے پاس بھیجا کرے گا۔

(۵) جو اراکین چندہ یا اپنے ذمہ کی دیگر رقوم روانہ کریں اُن کے نام مجلس انتظامی میں پیش کرے گا۔

(۶) انجمن کے تمام منظورہ بل ادا کرے گا۔

(۷) ہر سال کے اختتام پر تختہ وصول باقی تیار کرکے مجلس انتظامی میں پیش کرے گا۔

(۸) اپنی ذاتی تحویل میں (۵۰) روپیہ رکھ سکے گا۔ اس سے زیادہ رقم اس کھاتے میں جمع کرا دے گا۔ جو اس غرض کے لئے حسب دفعہ ۴۲ کسی بنک میں انجمن کے نام سے کھولا گیا ہو۔

دفعہ ۸:۔ انجمن کے حسابات کی تنقیح کے لئے ہر سال عام اراکین میں سے دو آڈیٹر مقرر کئے جائیں گے جو بعد تنقیح اپنی رپورٹ پیش کریں گے۔ آڈیٹروں کا انتخاب جلسہ عام میں ہوگا۔

باب ۴

مجلس انتظامی

دفعہ ۹:۔ انجمن کی مجلس انتظامی اُن تمام عہدہ داروں اور اراکین پر مشتمل ہوگی جن کا ذکر دفعہ ۳ میں ہوا ہے۔

دفعہ ۱۰:۔ مجلس انتظامی کا نصاب (۷) ہوگا جس میں سے عہدہ داروں کے علاوہ کم از کم چار رکن انتظامی ہوں گے۔

دفعہ ۱۱:۔ انجمن کے تمام کاروبار مجلس انتظامی انجام دے گی اور اس بات کی کوشش کرے گی کہ انجمن کے تمام مقاصد اور اغراض جو مختلف عنوانات کے تحت درج ہیں اُن کی تکمیل ہو۔

دفعہ ۱۲:۔ مجلس انتظامی کے فرائض حسب ذیل ہیں۔

(۱) ملاقاتی جلسے، ایٹ ہوم، ڈنر، اور اس قسم کے تمام تقاریب مقرر کرنا۔

(۲) ہر سال کا موازنہ آمد و خرچ (بجٹ) اور انجمن کی کارگزاری کے لئے ایک نظام العمل مرتب کرنا۔

(۳) وظائف اور انعامات کی تعداد اور نوعیت کا تصفیہ کرنا۔

دفعہ ۱۳:۔ تمام اہم کام مجلس انتظامی انجام دے گی۔ لیکن خاص خاص امور کے لئے

مجلس ایک ذیلی کمیٹی بنا سکتی ہے جو ان امور کے اختتام تک قائم رہے گی جن کے انجام دینے کے لئے وہ بنائی گئی ہے ذیلی کمیٹی کے اراکین کا انتخاب مجلس انتظامی ہی کرے گی۔

دفعہ ۱۴:۔ مجلس انتظامی کے کسی رکن کو دوسرے رکن کے ذریعہ رائے دینے کا حق نہ ہوگا۔

دفعہ ۱۵:۔ انجمن کے ہر معاملہ کی ذمہ داری مجلس انتظامی پر ہوگی۔

دفعہ ۱۶:۔ مجلس انتظامی کے جلسے ہر مہینے میں کم از کم ایک مرتبہ ہوا کریں گے۔

دفعہ ۱۷:۔ مجلس انتظامی کے چھ ارکان کی تحریری خواہش پر مجلس انتظامی کا جلسہ غیر معمولی طلب کرنا ہوگا۔

دفعہ ۱۸:۔ انجمن کے تمام امور میں مجلس انتظامی کو اندرون قواعد پورے اختیارات حاصل رہیں گے۔

دفعہ ۱۹:۔ مجلس انتظامی کے خلاف اپیل جلسہ عام میں ہو سکے گی اور اس اپیل کی منظوری کے لئے حاضرین جلسہ میں سے ⅔ دو ثلث کی تائید ضروری ہوگی۔

دفعہ ۲۰:۔ مجلس انتظامی معمولاً وقت واحد میں ایک سو روپیہ سے زائد خرچ نہیں کر سکیگی بجز اس کے کہ وہ جلسۂ عام سے منظوری حاصل کر چکی ہو۔ اور ایک کاروباری سال میں اس طرح خرچ کی مجموعی رقم بشمول رقم اقتداری صدر تین سو سے متجاوز نہ ہو سکے گی۔

دفعہ ۲۱:۔ اگر مجلس انتظامی کا کوئی رکن بغیر کوئی معقول وجوہات کے مسلسل تین جلسوں میں غیر حاضر رہے تو وہ مجلس انتظامی کا رکن باقی نہیں رہے گا۔ مجلس انتظامی باقی مدت کے لئے کسی اور رکن کا انتخاب کر سکتی ہے۔

باب ۵
انجمن کے جلسے

دفعہ ۲۲:۔ انجمن کے جلسے تین طرح کے ہوں گے:۔

(۱) انتظامی جلسے (۲) ایک عام جلسہ (۳) غیر معمولی جلسے۔

دفعہ ۲۳:۔ عام جلسوں کے انعقاد کا اعلان بہ تعین نظام العمل کم از کم دو ہفتہ قبل ہوگا۔ اور ایسے جلسہ میں پیش ہونے کے لئے تحریکات ایک ہفتہ قبل وصول ہو جانے چاہئیں۔

دفعہ ۲۴:۔ جلسہ عام کا نصاب بیس فیصد ہوگا۔

دفعہ ۲۵:۔ سالانہ عام جلسے کے انعقاد کی تاریخ کا تعین مجلس انتظامی کرے گی۔

دفعہ ۲۶:۔ غیر معمولی جلسوں کا انعقاد جب مجلس انتظامی ضرورت سمجھے یا کم از کم بیس ارکین کی تحریری درخواست پر ہو سکے گا۔ اور اُن کا اعلان کم از کم ایک ہفتہ قبل ہوگا۔

باب ۶
رکنیت

دفعہ ۲۷:۔ انجمن کی رکنیت کا عام چندہ سالانہ (عـ) روپیہ ہوگا جو ہر سال پیشگی وصول کیا جائیگا

توضیح:۔ معمولی اور ہمدرد اراکین بھی انجمن کی رکنیت میں داخل ہونے پر چندہ ادا کریں گے

دفعہ ۲۸:۔ اگر کوئی رکن شرکت انجمن کی تاریخ سے ایک ماہ کے اندر چندہ ادا نہ کرے تو وہ اس بناء پر رکن انجمن نہ رہ سکے گا۔

دفعہ ۲۹:۔ کوئی رکن جس کا نام انجمن کے اراکین کے رجسٹر سے خارج کر دیا گیا ہو دو بارہ رکنیت میں داخل ہونا چاہے تو اس کو دو روپیہ چندہ رکنیت اور سابقہ بقایا (اگر کچھ ہو) تو ادا کرنا ہوگا۔

دفعہ ۳۰:۔ جو اراکین کھیلوں میں بھی حصّہ لینا چاہیں انہیں علاوہ معمولی چندہ کے سالانہ

(۸ر) آٹھ آنے اور کھیلوں کی نوعیت کے لحاظ سے اس کا مقرر کردہ چندہ ادا کرنا ہوگا۔

دفعہ ۳۱:۔ اراکین یا ہمدردان انجمن اس کے مقاصد کی ترقی کی غرض سے انجمن کو کوئی عطیہ دیں تو وہ ہمیشہ شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔

دفعہ ۳۲:۔ انجمن کی تمام رقم امپیریل بنک آف انڈیا یا سنٹرل بنک آف انڈیا یا حیدرآباد کوآپریٹوڈومینین بنک کے چالو یا محفوظ کھاتے میں جمع رہے گی اور خزانہ دار اور معتمد کے مشترکہ دستخط سے حاصل کی جایا کرے گی۔

باب ۷

متفرق قواعد

دفعہ ۳۳:۔ انجمن کی اپنی ذاتی عمارت تیار ہونے تک سٹی کالج اس کا مرکز رہے گا۔ اور اشیاء متعلقہ انجمن کالج کے اُس کمرہ میں محفوظ رہیں گے جو کالج کے صدر سے مستعار لیا جائے گا۔

دفعہ ۳۴:۔ تمام اشیاء متعلقہ انجمن خزانہ دار کی حفاظت میں رہیں گی۔ بجز ان اشیاء کے جو انجمن کے دوسرے کارکنوں کے تفویض ہوں۔

دفعہ ۳۵:۔ نتائج ورزش اور تفریحات کے قواعد مجلس انتظامی کی مقرر کردہ کمیٹی مرتب کیا کرے گی۔

دفعہ ۳۶:۔ انجمن کا کاروباری سال ابتداء ماہ آذر سے آخر آبان تک متصور ہوگا۔

دفعہ ۳۷:۔ قواعد ہذا میں تبدیل و ترمیم کا حق اس جلسہ عام کو ہوگا جس میں منجملہ اراکین انجمن کے ½ اراکین موجود ہوں۔

ف ۳۸ قواعد ہذا کی تعبیر کا حق صدر انجمن کو ہوگا۔

